

**TEXT CUT WITHIN
THE BOOK ONLY**

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222210

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۴ Accession No. ۱۳۶۱۲

Author شریعت صدر ش - ب

Title نہایت ہی

This book should be returned on or before the date last marked below.

۴.۱.۳۶۱۳

پندتبی

ہندوستان کے بانیہ ناز ناول نویس شرت چندر چیسرجی کا شاہکار

مترجمہ
گوپال منیل بی آے

۱۹۴۲ء

پبلشرز میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور

بار اول

گیلفی ایکٹرک بریس لاہور

باہتمام پرنٹری پبلشر
سوم پرنٹری سہنی
نے لوہاری دروازہ سے شائع

تہمت

دیباچہ

شہرت چندر چیٹرجی سے اردو خواں پبلک اب کافی حد تک روشناس ہو چکی ہے۔ ان کے بعض ناولوں یعنی ”دیو داس“ اور ”بڑی دیدی اور منجھلی دیدی“ کے ترجمے میں نیشنل اکاڈمی کی طرف سے پیش کر چکا ہوں۔ پبلک نے جس گرمجوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا اس سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ اردو خواں پبلک بھی شہرت چندر کی پرستاری میں کسی اور پبلک سے پیچھے نہیں ہے۔

”پنڈت جی“ بھی اسی لافانی فنکار کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور اس کے بہترین ناولوں میں متصور ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ میری اپنی تہمیز کو شمشوں کا نتیجہ ہے اور اشاعت میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز کے زیر اہتمام ہو رہی ہے جو ہندوستان میں اردو زبان کے بہترین ناشرین میں شمار ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ ”دیو داس“ اور ”بڑی دیدی اور منجھلی دیدی“ کی طرح پنڈت جی کا بھی پبلک کی طرف سے فراخ دلانہ استقبال کیا جائیگا۔

گوپال مٹل

A Sad Story of two wrecked-hearted
Person, Society did not allow. He
to meet early. A ~~blow upon~~ Thunder
blow upon Society's

پہلا باب

کنج ویشنو کی چھوٹی بہن کشم کے بچپن کی تاریخ اتنی ڈراؤنی اور المناک تھی کہ اُس کی یاد ہی سے وہ شرم، ندامت اور دکھ کے مارے میں ہیں گڑ جاتی تھی۔ جب وہ دو برس کی تھی تو اُس کے باپ کا دیہانت ہو گیا تھا۔ اور ماں نے بھیک مانگ مانگ کر اپنے لڑکے اور لڑکی کو پالا پوسا تھا۔ پھر جب وہ پانچ برس کی ہوئی تو لڑکی کو حسین دیکھ کر باڈل گاؤں کے ایک امیر آدمی گورداس ادھیکاری نے اپنے بیٹے برندا بن کے ساتھ اُس کا بیاہ کر دیا۔ لیکن بیاہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد کشم کی ددھوا ماں کی از حد بدنامی پھیلی، اس لئے گورداس نے کشم کو چھوڑ کر اپنے لڑکے کا دوسرا بیاہ کر دیا۔

کشم کی ماں مصیبت زدہ اور غریب ہونے کے باوجود بہت خودا تھی۔ وہ بھی غصے میں آ کر اپنی لڑکی کو دوسری جگہ لے گئی اور اُسی مہینے میں ایک دوسرا لڑکا اُس کے ساتھ اُس کی کنٹھی بدلی کی رسم ادا کر دی۔ لیکن چھ ماہ کے اندر ہی وہ اصل فریالگی عالم حقے کو سہارا گئے۔

لیکن کُسم کی ماں کے سوا اور کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ لوگ کون تھے یا کس گاؤں کے رہنے والے تھے۔ حتیٰ کہ کُنج بھی اس بات سے نا آشنا تھا۔ اُس کی ماں کسی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ کُسم کی فی الحقیقت اُس بیزاری سے لکڑھی برلی گئی تھی یا یہ صرف لوگوں کی بات ہی بات تھی۔ یہ بھی کوئی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ سب باتیں کُسم کی سات برس کی عمر میں ہی ہو گئیں۔ اُسی وقت سے کُسم یہ وہ تھی۔ مختصر یہی اُس کے بچپن کی تاریخ ہے۔ اب وہ لٹولہ برس کی دوشیزہ تھی۔ حُسن اُس کے ہر عضو سے پھوٹا پڑتا تھا۔ اُس میں خوبیاں بھی ویسی ہی تھیں اور کام کاج کرنا میں بھی وہ ماہر اور ہوشیار تھی۔ اور پھر لکھنا پڑھنا بھی جانتی تھی کہ بہت بڑے آدمی کے گھر کے لئے بھی وہ شاید غیر موزوں نہ تھی۔

ادھر برنارڈین کے باپ اور اُس نے بعد اُس کی عورت بھی مرنا سوقت ان کی عمر بھی پچیس چھتیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اب وہ کُسم کو اپنے گھر لے آنا چاہتے تھے۔ پچاس روپے نقد، پانچ جوڑے دھوئی دھپٹے، اور کُسم کے لئے پانچ سونے کے اور ٹیوپا بندی کے زیورینے کے لئے بھی وہ تیار تھے۔ غریب کُنج نا تھا لایچ میں پڑ گیا تھا۔ اُس دلی خواہش تھی کہ کُسم رضا مند ہو جائے لیکن وہ تھی کہ دھیان ہی نہ دیتھی۔ ماں باپ کا سایہ سر پر نہ تھا۔ دونوں بھائی بہن ایک جھونپڑا میں رہتے تھے، جو گاؤں میں براہمنوں کے محلے کے اندر ہی واقع بچپن ہی سے کُسم براہمنوں کی لڑکیوں کے ساتھ کمیستی کو دتی آ رہی

اُنہی کے ساتھ وہ اتنی بڑی ہوئی تھی۔ اور اُنہی کے ساتھ ہر پنڈت کی پانچ سالہ میں وہ چھٹی تھی۔ اب بھی وہ برہمن زادیاں اس کی سگی سہیلیاں تھیں۔ اس لئے ان سب باتوں کا خیال کر کے اس کا تمام جسم نفرت اور شرم سے کانپ اُٹھتا تھا۔ میریا اور بیٹھے سے نیم بسل بنگال میں عورتوں کو بیوہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اُس کی بچپن کی سہیلیوں میں سے کتنی ہی اس کے مانند ہاتھوں کی پٹریاں توڑ کر اور مانگ کا سینہ رُخوڑا کر واپس اپنی جنم بھومی میں لوٹ آئی تھیں۔ اُن میں سے کوئی اُسکا گھر نہ مل سکا تھا اور کوئی مہار شاد نہ

چھی، چھی، اگر میں اپنے بھائی کی بات مان لوں، تو بھلا اس گاؤں میں زندگی بھر کبھی اپنا سیاہ مُنہ دکھا سکوں گی !
کنج نے کہا : ”ہن، تم میری بات مان لو۔ سچ پوچھو تو برہمن اس ہی تمہارے اصل خاوند ہیں“

کشم نے بڑھ کر جواب دیا : ”میں اصل نقل کچھ نہیں جانتی بھتیجا ! صرف یہی جانتی ہوں کہ میں دھووا ہوں۔ مجھے بھی کیا تم نے کُتبا، بلی سمجھ رکھا ہے کہ جو مرضی ہوگی وہی کر گزروں گی ! اُدھر بیاہ اور اُدھر کنٹھی بدلی ! اب پھر بیاہ ہو اور پھر کنٹھی بدے ! جاؤ، اب میرے سامنے ایسی باتیں

۱۵ بنگال میں عورتیں اپنی سہیلیوں کا خاص نام رکھ لیتی ہیں اور انہیں ہی نام سے پکارتی ہیں۔ گہری دوستی ہی میں اس طرح کے نام رکھے جلتے ہیں“ (مترجم)

کرنا۔ باڈل والے میرے کوئی نہیں ہیں، میرے سوامی مرچکے ہیں اور میں
دو دھوا ہوں۔“

بیچارہ کُنچ جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ اپنی تعلیم یافتہ اور
شہد مزاج بہن کے سامنے وہ سٹیٹا جاتا تھا۔ لیکن وہ ایک اور نقطہ نگاہ
سے بھی سوچتا تھا۔ ————— وہ بہت غریب ہے، اُس کے پاس
یہی دو جھونپڑیاں ہیں اور اُن سے ملا ہوا آم اور کھٹل کا چھوٹا سا باغچہ۔
اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس لئے اتنے نقد روپے اور اتنی
دھونیاں، دوپٹے اُس کے لئے معمولی بات نہ تھی۔ اگر اس طرح سے
قطع نظر بھی کر لی جائے، تو اپنی محبت کی واحد حصہ دار —————
چھوٹی بہن کو کسی اچھی جگہ آباد اور خوش و خرم دیکھ کر وہ خود بھی سرور
ہونا چاہتا تھا۔

اُن لوگوں کی برادری میں کنٹھی بدلنے کا رواج ہے، اسی لئے
اُس کی ماں یہ رسم کرا گئی تھی۔ لیکن یہ بات کُنچ کی سمجھ میں نہیں آتی تھی
کہ جب ماں مچھکی ہے اور کُسم کا شہر برتتا ہے تو اُسے پھر اپنے یہاں
لے جانے کے لئے تیار ہے۔ ————— اتنی منت سماجت کر رہا
ہے، منار رہا ہے، تو کُسم کیوں ایسے سُہرے موقعے کو ہاتھ سے گنوائے؟
وہ کیوں اُس کی طرف دھیان نہیں دیتی؟ صرف سماج کے ٹھیکیداروں
اور فوجداروں کی منظوری لے کر تھوڑا سا مالٹا بھوگ ہی تو دینا ہے!

لے مالٹا ایک رسم ہے یعنی ہٹی کے گونڈے میں دہی وغیرہ بھر کر پہلے بھگوان کی نذر کرے
پس اوپر دہی سب کو بانٹ دیتے ہیں جیسے سالانہ ایک طبقہ میں بیوی جی کا گونڈا معروف ہے،

شادی کا تمام خرچ تو برتہا بن ہی دینگے۔ اس کے بعد وہ تمام تکالیف و مصائب سے آزاد ہو کر عیش و راحت میں رانی بن کر زندگی بسر کرے گی۔ کسم بھی کیسی احمق ہے! آہا، اگر وہ خود کسم ہوتا۔۔۔۔۔! بس گنج روزانہ اسی قسم کی باتیں سوچا کرتا ۛ

وہ پھیری کا کام کرتا تھا۔ ایک بڑے سے ٹوکرے میں سوت کے ازار بند، مالا، گنگھی، سیندھور، خوشبودار تیل، پوڈر، پنچول کے لئے کھلونے وغیرہ کچی قسم کی چیزیں سر پر رکھ کر روزانہ دو چار گاؤں میں پھیری لگایا کرتا تھا۔ دن بھر چیزیں فروخت کر کے جو پیسے لاتا، شام کو سب اپنی بہن کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ وہ نہ تو یہ بات سمجھ ہی سکتا تھا اور نہ سمجھنے کی کوشش ہی کرتا تھا کہ کسم کس طرح اصل پونجی محفوظ رکھ کر روزمرہ کا خرچ مزے سے پورا کر لیتی ہے ۛ

ایک دن صبح ہی وہ گھومتا پھرتا باڈل گاؤں جا پہنچا۔ راستے میں برنما بن مل گئے۔ وہ کسی کام سے کہیں باہر جا رہے تھے، لیکن گنج کو دیکھ کر ٹوٹ پڑے۔ وہ اپنے رشتہ دار کو بڑی عزت سے گھیر لائے۔ ہاتھ پاؤں دھونے کے لئے پانی لا کر دیا اور حلیم میں تمباکو بھر کر اُس کی خاطر تواضع کی۔ دوپہر کے وقت اُن کی ماں نے طرح طرح کے کھانے بنا کر گنج کو بیٹ بھر کھانا کھلایا اور دھوپ میں اُسے کسی طرح بھی روانہ ہونے نہ دیا ۛ

شام کے بعد گنج ٹوٹ کر گھر آیا اور ہاتھ پیر دھو کر کچھ چنا چینا کھانے لگا۔

کھاتے کھاتے اُس نے بہن کو دن بھر کی سب باتیں کہہ سناٹیں اور آخر میں یہ بھی کہا کہ وہ ایک اچھا گھرانہ ہے۔ باغ باغیچہ، کھیتی باڑی، کسی چیز کی کمی نہیں۔ لکشمی تو اُن کے گھر کی گویا ایک باندی ہے * کسٹم سب باتیں چُپ چاپ سنتی رہی، اُس نے کوئی جواب نہ دیا، کُنج نے اسے ایک اچھا موقعہ تصور کیا اور نہایت تفصیل سے بتایا کہ برہنہ بن کی ماں نے کیسی اچھی اچھی چیزیں بنائیں اور کیسی عزت پیار اور شفقت سے اسے کھلائیں۔ کھلانے پلانے کے بعد بھی کیا وہ کہیں مجھے چھوڑتی تھیں! کہنے لگیں ”اتنی دھوپ میں جاؤ گے تو سرد در در کرنے لگے گا اور بیمار ہو جاؤ گے“

کسٹم نے اپنے بھائی کے مُنہ کی طرف دیکھ کر کچھ مُسکراتے ہوئے کہا: ”تو آج دن بھر تم انہی کانوں میں لگے رہے! بس خوب شکم سیر ہو کر کھایا اور پاؤں پسا کر سیٹے“

کُنج نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا: ”تو پھر تم ہی بتاؤ بہن! میں اور کیا کرتا؟ جب وہ کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھیں، تو زبردستی کیونکر چلا آتا؟“

کسٹم نے کہا: ”اچھا، لیکن اب تم اُس گاؤں میں نہ جایا کرو“۔ کُنج کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح نہ آئی۔ اُس نے پوچھا: ”کیوں نہ جایا کروں؟“

کسٹم نے کہا: ”وہ تو جب بھی تمہیں راستے میں ملیں گے، ہکڑ

لے جائیں گے۔ وہ بڑے آدمی ٹھہرے۔ اُن کا لڑکائی ہرج نہ ہوگا لیکن اس طرح ہمارا کام کیونکر چلے گا؟

کنج بہن کی اس بات سے بہت سنجیدہ ہوا۔ کسٹم نے اُس کے دل کی بات سمجھ کر ہنستے ہوئے کہا: ”نہیں بھئی! میں یہ بات نہیں کہتی۔ بھلا دو ایک دن جلنے میں کون سا بڑا نقصان ہوا جاتا ہے! لیکن، وہ لوگ ٹھہرے بڑے آدمی اور ہم ہیں غریب۔ ہمیں اُن سے دیاؤ میل جول بڑھانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”لیکن بہن! کنج نے کہا: یہ میں خود تو اُن کے گھر نہیں جاتا۔“
 ”ہاں ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم خود نہیں جاتے لیکن اگر وہ آپ بلا کر بھی لے جائیں تو بھی ہمیں جانے کی کیا ضرورت؟“
 ”ہوں! اگر وہی بات ہے تو پھر تم ان براہمنوں کی لڑکیوں سے کیوں اتنا میل جول رکھتی ہو؟ یہ سب بھی تو بڑے آدمیوں ہی کی لڑکیاں ہیں پھر کیوں جاتی ہو ان کے پاس؟“

اپنے بھائی کے دلی جذبات کو سمجھ کر کسٹم نے ہنستے ہوئے کہا:۔
 ”اُن کے ساتھ تو میں بچپن سے کھیلتی آرہی ہوں۔ اور پھر نہ تو وہ ہماری ذات کی ہیں اور نہ ہمارے سماج کی۔ اُن کے یہاں جانے میں ہمارے لئے کوئی شرم کی بات نہیں لیکن اُن کی بات دوسری ہے، کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کنج نے کہا: ”نہیں، اُن کے یہاں جانے میں بھی کوئی شرم کی بات نہیں۔ اُن پر لکشی کی عنایت ضرور“

ہے، اُن کے پاس چار پیسے بھی ہیں، لیکن غرور و تکبر اُن میں نام کو بھی نہیں۔ سب گویا مٹی کے پتیلے ہیں — بے ضرر۔ برندا بن کی ماں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر جس طرح“

بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کُسم بیچیں ہو کر بول اُٹھی: ”پھر وہی پڑائی باتیں نکلیں! ہماری ماں پر انہوں نے اتنا بڑا کلنک لگایا تھا، معلوم ہوتا ہے، بھتیجا تم سب بھول گئے؟“

کنج نے مخالفت کرتے ہوئے کہا: ”انہوں نے کسی سے ایک بات بھی نہیں کہی۔ بعض بد معاشوں نے حسد کے باعث جھوٹ موٹ بدم کیا تھا۔“

”اسی لئے اُن لوگوں نے ہمیں گھر سے نکال کر دوسرا بیاہ کر لیا تھا! کیوں؟“

کنج نے کچھ لا جواب سا ہو کر کہا: ”ٹھیک ہے، لیکن اس میں بیچارے برندا بن کا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ اگر تھا تو اُن کے باپ کا“
 قدرے خاموشی کے بعد کُسم نے پُر سکوں لہجے میں کہا: ”اچھا بھتیجا، خواہ کسی کا قصور ہو، لیکن جو بات ہوگی نہیں، ہونے والی ہی نہیں، اُس ایک ہی بات کو بیس دفعہ دہرانے سے فائدہ؟ میں تم سے بحث نہیں کر سکتی۔ جانے دو!“

کنج پہلے تو بہن کی چوٹ کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر بخندہ سا ہو کر بولا: ”تم تو بحث نہیں کر سکتیں، لیکن مجھے تو سب طرف دیکھنا

ہڑتا ہے۔ ذرا سوچو تو۔۔۔۔۔ اگر آج میں مرجاؤں تو کل تمہاری کیا حالت ہوگی؟

کسٹم کا دل بیچین ہوا اٹھا تھا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا +
کنج پھر کہنے لگا: ”اپنے جتنے واقف آشنا اور بڑے بوڑھے ہیں،
اُن سب سے دریافت کر چکا ہوں۔ تمہاری ساس نل ڈانگے کے بوڑھے
باباجی تک سے رائے لے آئی ہیں۔ تم جانتی ہو، اُن سب لوگوں نے
بڑی خوشی سے اجازت دے دی ہے؟“

کسٹم کا چہرہ ایک دم تنمّا اُٹھا، درشتی کے آثار پیدا ہو گئے۔ لیکن
وہ اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئی: ”ہاں، جانتی کیوں نہیں؟“

اس کے بارے میں، اس کی ماں کے بارے میں، اور اس کی کنٹھی
بدلنے کے بارے میں، سماج میں تنقید ہو رہی تھی، اور اچھے اچھے لوگوں
کی منظوری لی جا رہی تھی، اس تذکرے سے کسٹم کو بیحد غصہ آیا۔ مگر
اُس نے اپنے تاثرات کو دبا کر تو چھا: ”کیوں بھیا! اس وقت تم کیا
کھاؤ گے؟“

کنج نے بہن کا مطلب سمجھ لیا، اور منہ بھاری کر کے کہا: ”کچھ نہیں،
مجھے بھوک نہیں ہے۔“

کسٹم کو اور بھی زیادہ غصہ آ گیا۔۔۔۔۔ مگر وہ غصہ روک کر
چُپ چاپ اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی +

کنج نے دیں بیٹھے بیٹھے چلم میں تمباکو بھر کر پیا۔ پھر حقہ دیوار کے

سہارے کھڑا کر کے پکارا: ”کُسم!“
 کُسم اپنی کوٹھری میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ اُس نے وہیں سے
 پوچھا: ”کیا ہے؟“

”میں کہتا ہوں، اتنی رات ہو گئی، کچھ کھانے کو نہیں بناؤ گی؟“
 کُسم نے وہیں سے جواب دیا: ”نہیں، آج کچھ نہیں بنے گا۔“
 ”یہی تو پوچھتا ہوں کہ کیوں نہیں بنے گا؟“

کُسم نے بگڑ کر کہا: ”مجھ سے تو دفعہ نہیں کہا جاتا۔“

بہن کی یہ بات سن کر کنج دھم دھم کرتا ہوا اُس کی کوٹھری میں جا پہنچا
 اور چلا کر بولا: ”دیکھو کُسم! مجھے دیا وہ نہ چلاؤ۔ اگر اسی طرح وق کیا
 کرو گی، تو جلد صریر اُٹنے لگے گا چلا جاؤ لگا۔۔۔ یہ کہے دیتا ہوں!“
 ”جاؤ ابھی چلے جاؤ۔“ کُسم نے نند لہجے میں کہا: ”میں گھر میں اس
 طرح ڈوم چاروں کی طرح چیخنے چلا لے نہ دوں گی۔ تمہارے جی میں آئے
 تو باہر گلی میں جا کر جتنا ہو سکے پورے زور سے چیخو چلاؤ۔“

کنج نے انتہائی غصے میں کہا: ”کبخت! تو چھوٹی بہن ہو کر بڑے
 بھائی کو گھر سے نکال رہی ہے؟“

”ہاں نکال رہی ہوں۔ تم بڑے ہو۔۔۔ اس لئے کیا تم
 ہر معاملے میں من مانی کر دگے؟“

بہن کے منہ کی طرف دیکھ کر کنج دل ہی دل میں ڈر گیا، کچھ نرم ہو کر
 بولا: ”بھلا بتا تو دو، میں نے ایسا کون سا کام کیا ہے؟“

”تو مجھ سے پوچھے بغیر کیوں وہاں گئے اور کیوں اُن کے گھر سے کھانا کھایا؟“

”لیکن اس میں ہرج کیا ہو گیا؟“

”اس میں ہرج کیا ہو گیا؟ بہت بڑا ہرج ہو گیا۔ میں آج منع

کئے دیتی ہوں، اب وہاں کبھی نہ جانا“

کنج بڑا بھائی تھا۔ لڑائی جھگڑے میں چھوٹی بہن سے ہار ماننے میں اُسے نہ اذیت سی محسوس ہوتی۔ اُس نے کہا: ”کیا تو مجھ سے بڑی ہے جو مجھ پر حکم چلاتی ہے؟ میرا جہاں جی چاہے گا جاؤنگا۔“

کُسم نے بھی اُسی طرح دور سے کہا: ”نہیں، کبھی نہیں جافے دوں گی۔ اگر میں نے سُن لیا تو اچھا نہ ہو گا بھتیجا، میں صاف کہے دیتی ہوں۔“ اب کنج سچ مچ ڈر گیا۔ پھر بھی اُس نے ظاہر اُرحب قائم رکھنے کے لئے کہا: ”جاؤنگا تو کیا کرو گی؟“

کُسم سلائی کا سامان پھینک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور چلا کر بولی:-
”دیکھو، میں کہے دیتی ہوں بھتیجا! مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ میرے سامنے سے چلے جاؤ کہہ رہی ہوں ہٹ جاؤ۔“

کنج کچھ شپٹا کر کوٹھری سے نکل آیا، اور دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو کر بولا: ”تیرے ڈر کے مارے ہٹ جاؤں گا!! اگر وہاں جاؤں گا تو کیا کرنے گی تو؟“

کُسم نے کچھ جواب نہ دیا۔ چراغ کی بقی کچھ اور بڑھا کر اُس کی

روشنی تیز کر کے پھر سینے لگی۔ آٹھ میں کھڑے ہوئے کُنج کی ہمت پھر بڑھ گئی، اور اُس نے اپنا لہجہ کچھ اور تیز کر کے کہا: ”مثل مشہور ہے — آپ ڈائن کی طرح چلائے گی تو کچھ نہیں، میں ذرا زور سے بولوں تو...“ یہ کہہ کر کُنج رُک گیا، لیکن جب اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا۔ باہر جا کر اپنا حُفّہ اٹھا لایا اور بوہنی دوش لگا کر گلے کی آواز اور بلند کر کے بولا: ”جب میں بڑا ہوں، جب میں گھر کا مالک ہوں، تو سب کام میرے ہی حکم سے ہوگا۔“ یہ کہہ کر اُس نے جلی ہوئی چلم اُلٹ دی، اور پھر تنہا کو بھرتے ہوئے زور سے کہا: ”مجھے کسی کی بات سُننے کی ضرورت نہیں۔ میں ہر مرتبہ نہیں، سُننا نہیں چاہتا۔ جب میں گھر کا مالک ہوں، جب گھر بار سب میرا ہے، تو میں جو کچھ کہوں گا، وہی...“

اچانک اُس نے پیچھے پاؤں کی چاپ سُنی اور جب مُنہ پھیر کر دیکھا تو وہیں بات کو نا تمام چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

کسٹم چُپ چاپ آ کر تیز نگاہ سے اُسے دیکھ رہی تھی اُسے متوجہ دیکھ کر بولی: ”یہاں بیٹھے بیٹھے لڑائی کرو گے یا جاؤ گے یہاں؟“

چھوٹی بہن کی اس تیز نگاہ کے سامنے بڑے بھائی کا مالک بننے کا تمام حوصلہ کا فور ہو گیا۔ اُس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

کسٹم نے پھر اُسی طرح کہا: ”بھئی! بتاؤ، یہاں سے جاؤ گے یا نہیں؟“

اب نہ تو وہ کچھ ناتھ رہ گیا تھا اور نہ اُس کا وہ کلا۔ اُس نے بھرائی
 ہوئی آواز سے کہا: ”کہا تو ہے کہ تمہا کو بھریوں، پھر جاتا ہوں۔“
 کسٹم نے ہاتھ بڑھا کر کہا: ”لاؤ، مجھے دو“ یہ کہہ کر وہ اُس کے
 ہاتھ سے چلم لے کر چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد واپس آکر چلم خُفّے
 پر رکھتے ہوئے بولی: ”سُنا روں کی دُکان پر جاؤ گے نا؟“
 کچھ نے میر ہلا کر کہا: ”ہاں“۔

کسٹم نے نرمی سے کہا: ”اچھا جاؤ۔ مگر دیکھو، بہت رات نہ کر دینا۔
 مجھے رسوائی بنانے میں دیر نہیں لگے گی۔“
 کچھ ناتھ ہاتھ میں خُفّے لئے ہوئے آہستہ آہستہ باہر چلا گیا۔



دوسرا باب

اُس دن سنج نے اپنی بہن کو بند راہن کے گھر بار کے متعلق جو کچھ بتایا تھا۔ اُس میں کسی قسم کا جھوٹ یا مبالغہ نہ تھا۔ سنج مچ اُن کے گھر میں کشمی کا باس تھا۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ اُس کے لئے اُن کے گھر میں کسی کو بھی کسی طرح کا تکبر، غرور یا فخر نہیں تھا۔

اُس گاؤں میں کوئی پاٹھشالہ نہیں تھی۔ بند راہن نے بچپن میں اپنی ہی کوشش سے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور اُس وقت سے اپنے گاؤں میں پاٹھشالہ کھولنے کا عہد کر لیا تھا۔ لیکن اُن کے پتا گورداس بڑے ہیشیار آدمی تھے۔ مگر چہ برہنہ بن اُن کا اکلوتا لڑکا تھا پھر بھی انہوں نے ایسے واہیات کام میں اپنے بیٹے کو امداد نہ دی۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد بند راہن نے اپنے چند سی منڈپ میں ایک ایسی پاٹھشالہ کھول دی جس میں بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی اور اس طرح اُس نے اپنا وہ دیرینہ عہد عملی صورت میں پورا کر دیا۔ اُن کے محلے میں ایک پُرانے تعلیم یافتہ پنشنر تھے۔ اُن کو بند راہن نے

انگریزی پڑھانے کے لئے رکھ لیا۔ وہ رات کے وقت آکر ہڑھا جابا کرتے تھے۔ اس لئے یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہوئی۔ گاؤں بھر میں کسی کو بھی معلوم نہیں کہ ویشنو بندرا بن انگریزی پڑھے ہوئے ہیں۔ آج سے پانچ برس پہلے، بیوی کی وفات کے بعد وہ لکھنے پڑھنے ہی میں لگے رہتے تھے، عموماً رات بھر پڑھا کرتے، صبح گھر کے کام کاج اور زمینداری وغیرہ دیکھتے اور دوپہر کو اپنی قائم کی ہوئی پاٹھشالیہ میں رکیان بچوں کو پڑھا یا کرتے۔ جب بیوہ ماں دوبارہ شادی کرنے کا تقاضا کرتی تو وہ اپنے چھوٹے سے بیٹے کو دکھا کر کہہ دیا کرتے کہ جس کے لئے شادی کی جاتی ہے، وہ ہمارے پاس ہے۔ پھر دوسری شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ماں بہت کچھ روتی پیٹی، لیکن وہ کچھ بھی نہ سنتے، اسی طرح دو برس گور گئے۔

اس کے بعد ایک دن بندرا بن نے اچانک کنچ ویشنو کے مکان کے سامنے کُسم کو دیکھا۔ کُسم ندی سے استنان کر کے مکہ پر پانی کی کھی رکھے گھر آ رہی تھی۔ اُس وقت اُس نے شباب میں پاؤں رکھا ہی تھا، بندرا بن محبت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتے رہ گئے اور جب کُسم اپنے گھر میں چلی گئی، تو وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئے۔ اس گاؤں کے سب گھروں کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اس لئے وہ جان گئے کہ وہ لڑکی کون ہے۔

ایک اولاد ہونے پر ماں بیٹے میں جو تعلق ہوتا ہے، بندرا بن اور

اُن کی مائیں بھی وہی تعلق تھا۔ انہوں نے گھرا کر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی ماں سے کُستَم کی بات کہہ دی۔ ماں نے کہا — ”ارے بیٹا، بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے؟“ ان لوگوں میں تو دوسرے بے بندرا بن نے جواب دیا — ”وہ ہوا کرے ماں، پھر بھی وہ تمہاری ہوئے۔ جب میری ماں شادی کی تھی، تو اُس وقت یہ بات کیوں نہ سوچی؟“

ماں نے کہا — ”وہ سب تمہارے بابو جی جانتے تھے — اُنہوں نے جو کچھ اچھا سمجھا کر گئے۔“

بندرا بن نے فخر پر لہجہ میں کہا — ”اچھا، تو پھر ایسا ہی سی ماں‘ میں جیسا ہوں، ویسا ہی رہوں گا۔ اب تم مجھے شادی کے لئے تنگ نہ کرنا۔“

اتنا کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

اس بات کو بھی تین سال گزر گئے۔ اس درمیان میں بندرا بن کی ماں نے کُستَم کو اپنے گھر لانے کی بہت کوشش کی، لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ کُستَم کسی طرح رضا مند ہی نہ کی جاسکی۔ کُستَم کی اس مستقل اور سخت مخالفت کی بہت سی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے عاجز اور کم عقل بھائی کو اکیلے چھوڑ کر وہ کہیں بھی جا کر کُستَمی نہیں رہ سکتی اور دوسری وجہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں۔

اگر وہ کسی طرح سماج کے رسم و رواج کی پابندی کئے بغیر آسانی سے

اپنے پتی کے گھر جا کر آباد ہو سکتی، تو شاید وہ اپنے بھائی کے اصرار کا اس استقلال کے ساتھ مقابلہ نہ کرتی لیکن وہ سوچتی کہ اب پھر سب کام دوبارہ کرنے ہونگے، طرح طرح کے ویشنوؤں کے گروہ آکر کھڑے ہونگے۔ میری ماں کی جھوٹی بدنامی کی چرچا چھڑے گی، میرے اپنے بچپن کے گزڑے ہوئے واقعات دہرائے جائیں گے۔ اور بھی نہ جانے کن کن باتوں کا ذکر ہوگا۔ ہر طرف شور و غوغا ہوگا۔ پاس پڑوس کے لوگ تماشا دیکھنے آئیں گے۔ میری سکھی سہیلیاں آکر حیرت آمیز سمجھا ہوں سے تاک جھاک کر بیگی اور پھر اپنے اپنے گھروں میں جا کر ہنستی ہوئی سیدھی سادی زبان میں کہیں گی کہ ”دو دم چماروں کی طرح کسٹم کا نکاح ہو گیا۔“ چھی! چھی!! ان سب باتوں کا خیال کر کے ہی وہ شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتی ہے۔ نیکس گھروں کی جن لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر اُس نے لکھنا پڑھنا سیکھا ہے، اور جن کے ساتھ ساتھ وہ اتنی بڑی ہوئی ہے، غریب ہونے پر بھی وہ اپنے دل میں اس بات کو جگہ نہیں دے سکی کہ عادات و کردار وغیرہ میں وہ اُن لوگوں سے کسی طرح پیچھے رہ جائے۔

کل شام کو اپنے بھائی کے ساتھ کسٹم کی کھانسی ہوئی تھی۔ اُس نے ناراض ہو کر ندی کے صندوق کی چابی اپنے بھائی کے پاؤں میں پھینک دی تھی، اور غصے میں بھر کر کہا تھا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں اس دُنیا میں نہ رہوں گی۔ آج صبح کے وقت جب وہ ندی سے نہا کر واپس آئی، تو اُس نے دیکھا کہ بھائی گھر میں نہیں ہے، کہیں چلا گیا ہے اُسکا

پھیری والا تقبلا بھی گھر میں نہیں ہے۔ کُسم نے دل ہی دل میں کچھ ہنستے ہوئے کہا: ”بھیا کل رات کو کچھ جھڑکیاں کھا کر آج صبح ہی بھاگ کھڑے ہوئے ہیں“ اس میں شک نہیں کہ اپنی کل والی غلطی کی تلافی کرنے کے لئے ہی وہ آج چلا گیا ہے، لیکن کُسم نے جو اندازہ لگایا وہ درست نہیں۔ وہ غلطی اور یہی تھی اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ ظاہر ہو گئی۔

کُسم کو ہر روز صبح سویرے اُٹھ کر گھر کے سب کام کرنے پڑتے۔ سارا گھر اور آٹمن گوبر سے پوتنا پڑتا، آٹمن خوب جھاڑ کر صاف کرنا پڑتا، ندی سے نہا کر پانی لانا پڑتا۔ اور پھر اپنے بھائی کے لئے کھانا بنانا پڑتا۔ جب کُنج پھیری کے لئے باہر چلا جاتا، تو وہ پوچھا پٹھ کرنے بیٹھتی۔ جس دن کُنج صبح ہی بغیر کھانا کھائے چلا جاتا اُس دن وہ دوپہر ہی کو واپس لوٹ آیا کرتا۔ کُسم نے سوچا کہ ابھی بھائی کے آنے میں بہت دیر ہے۔ اس لئے وہ پھول چُسنے لگئی۔ آٹمن میں ایک طرف پھولوں کے کچھ پودے تھے۔ چمیلی اور جُجی کے بھی کچھ پیر تھے۔ انہی سے وہ اپنی روز کی پوچا کے لئے پھول چُن لیا کرتی۔ پھول چُن کر اور سب دھندوں سے فارغ ہو کر جیسے ہی وہ پوچا پر بیٹھی، اُس کے دروازے پر کئی بیل گاڑیاں آکھڑی ہوتیں اور اُس کے بعد ہی ایک بوڑھی عورت دھٹکے سے دروازہ کھولتی ہوئی اندر آئی۔ تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسری کو دیکھتی رہیں کُسم نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ناک ہر تھک اور گلے میں مالا دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ ہو چاہے کوئی، لیکن ہنر میری جاتی کی ہی۔

بڑھی نے کسم کے پاس پہنچ کر ہنستے ہوئے کہا — ”بیٹی تم تو مجھے نہ پہچانتی ہوگی۔ لیکن تمہارے بھائی پہچانتے ہیں کنج ناٹھ کہاں رہتے؟“ کسم نے جواب دیا۔ وہ تو آج صبح ہی سے کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ غالباً دیر سے آئینگے۔“

اجنبی عورت نے حیرت سے کہا — ”ہیں! دیر سے آئینگے! ابھی کل ہی تو وہ اپنے بہنوئی اور دو سکر بھی چار پانچ لڑکوں کو — وہ بھی ہمارے اپنے ہی ہیں، رشتے میں بھانجے ہوتے ہیں! — کھانے کی دعوت دے آئے ہیں۔ اس لئے میں نے بھی آج سویرے ہی بند رابن سے کہہ دیا کہ بیٹا، گاڑی بان سے کہہ دو کہ گاڑی جوت کر لے آئے، میں بھی چل کر ذرا ہو کو دیکھ آؤں اور آشیر وادے آؤں۔“ یہ سن کر کسم حیران رہ گئی۔ لیکن فوراً اپنے آپ کو سمجھال کر پیشانی کا آئینہ کھینچ کر اور زیادہ گھونگھٹ نکال لیا۔ اس کے بعد وہ پر نام کر کے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی، کوٹھڑی میں سے آسن لاکر بھجادی اور خود خاموش کھڑی ہو گئی۔ کسم نے سمجھ لیا کہ یہ ساس ہیں۔ وہ آسن پر بیٹھ کر ہنستی ہوئی بولیں :-

”کل کھاپی چکنے کے بعد بند رابن نے ہنستے ہوئے کہا کہ میں ایسا قیمت ہوں کہ کنج بھیا ہیں تو میرے بڑے بھائی کی جگہ، لیکن انہوں نے آج تک کبھی مجھ سے یہ بھی نہیں کہا کہ کل تم آکر ہمارے ہاں ایک لوطا پانی پی آنا۔ یاد رکھی دوں سے میری نند کے لڑکے بھی میرے ہی

یہاں ہیں۔ اس پر گنج نے ہنستے ہوئے اُن سب کو بھی دعوت دے دی۔ اس لئے وہ سب آگئے ہیں۔“

گنیم سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔
ہندربان کی ماں پچلے درجہ کی عام عورتوں کی مانند نہ تھی۔ وہ بہت سمجھدار تھی۔ گنیم کے چہرے کے جذبات دیکھ کر اچانک اُسے شک ہوا کہ ضرور کوئی نہ کوئی گول مال ہوا ہے۔ اُس نے محبت سے پوچھا: ”میں نے کیا کیا تم سے کچھ بھی نہیں کہہ سگئے؟“
گنیم نے گھونگھٹ کے اندر سے ہی سر ہلا کر جواب دیا۔

”نہیں!“

لیکن ہندربان کی ماں یہ نہیں سمجھ سکیں، بلکہ انہوں نے سوچا کہ وہ کہہ کر ہی گیا ہے۔ اس لئے مطمئن ہو کر کہا۔
”جب تو ٹھیک ہے۔“ اس کے بعد گنج ناتھ کے متعلق محبت بھرے جذبات سے کہا۔
”ڈر تھا کہ کہیں میرا پاگل بیٹا سب باتیں بھول نہ گیا ہو۔ اب تو میں سمجھتی ہوں کہ وہ کچھ سودا سلف خریدنے گیا ہے، تھوڑی ہی دیر میں آ جائیگا، لویہ سب بھی آگئے۔“

ہندربان نے ایک دفعہ باہر ہی سے پکارا۔ ”گنج بھیا!“ اور اُس کے بعد وہ جھٹ آٹن میں آکھڑے ہوئے۔ اُن کے ساتھ اور بھی تین لڑکے تھے۔ یہی اُن کے پھوپھیرے بھائی تھے۔ اُن کی ماں نے کہا۔ ”گنج ناتھ ابھی کہیں باہر گیا ہے۔“ اور ہوا اندر ذرا شطرنجی بچھا دو،

یہ لوگ بیٹھ جائیں؟“

کُتسم نے کچھ بچپن سی ہو کر اپنے بھائی کی کوٹھڑی میں ایک کبل بچھا دیا اور ہاتھ میں چلم لے کر تبا کو بھرنے رسوئی گھر میں چلی گئی +
یہ دیکھ کر بند رابن نے ہنستے ہوئے کہا ”رہتے دو، ہم لوگ تبا کو نہیں پیتے؟“

کُتسم ہاتھ سے چلم رکھ کر رسوئی گھر میں ایک کھجے کے ساتھ چُپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ اس کا نام بھجھ بھائی اسے کیسی مصیبت میں ڈال کر کسک گیا۔ غصہ، خود داری، شرم اور ہونے والی بے عزتی کو سوچ کر اُس کی آنکھوں میں پانی بھرا آیا۔ کل ہی اُس کے گھر کی سب چیزیں ختم ہوئی ہیں۔ آج صبح نہانے کے لئے جانے سے پہلے اُس نے سوچا تھا کہ لوٹ کر آؤنگی تو بھیا کو بازار بیچوں گی۔ لیکن واپس آ کر دیکھا تو بھائی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جب گُنج کوئی قصور یا غلطی کر بیٹھتا ہے۔ تو اپنی چھوٹی بہن سے اتنا ڈرتا ہے، کہ کوئی نوکر اپنے ظالم مالک سے بھی نہ ڈرتا ہوگا۔ جن بڑے آدمیوں کے گھر صرف کھانا کھا آنے کے قصور ہی میں کُتسم نے اتنی زیادہ ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ گرمی میں آ کر گُنج انہی بڑے آدمیوں کو خاندان سمیت دعوت دے آیا ہے! یہ قصور اُس پہلے قصور سے بھی زیادہ بھاری تھا۔ اس لئے اپنی بہن سے کچھ کہنے کا اُسے حوصلہ نہ پڑا اور وہ صبح اٹھ کر بھاگ گیا۔ اب جو چاہے وہ ہرات سے پہلے وہ گھر نہیں آئیگا۔ یہ بات یقینی طور پر سمجھ لینے کی

وجہ سے کُسم آنے والی مصیبت کا خیال کر کے بیچین ہوا اٹھی۔ اور سب سے بڑھ کر مصیبت یہ ہوئی کہ جس صندوق میں اُس کے اکٹھے کئے ہوئے قصوں سے روپے تھے اُس کی چابی بھی اُس کے پاس نہیں تھی۔ اور نہ اس وقت اُس کے ہاتھ میں ایک پیسہ ہی تھا۔

کُسم مایوس ہو کر قریباً پانچ منٹ تک کھڑی رہی۔ اس کے بعد اچانک اُس کا ساہرا غصہ بند را بن پر برس پڑا۔

دراصل سارا قصور انہی کا ہے۔ کیوں یہ میرے نام سمجھ بھائی ہو رہا ہے میں سے پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور کیوں انہوں نے یہ سب مذاق کیا؟ اور یہ ہوتے کون ہیں، جو بھیّا انہیں اپنے گھر بلا کر کھانا کھلائیں گے؟

گدشتہ تین برس سے کتنے ہی بہانوں، کتنی ہی ترکیبوں سے، بند را بن ادھر آتے جاتے رہے ہیں، اور کئی دفعہ صبح شام بلا مقصد بھی مکان کے سامنے سے نکل گئے ہیں۔ ہم لوگوں کی حالت کتنی خراب ہے یہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں اور شاید اسی لئے انہوں نے جان بوجھ کر ہمیں نیچا دکھانے کے لئے یہ جھگڑا کھڑا کیا ہے۔“

کڑی کی مورتی کی مانند کھڑی ہوئی کُسم اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگی۔ وہ بڑی خوددار لڑکی ہے۔ لیکن اس وقت وہ اکیلی ہے، کیا کرے؟

بند را بن کی ماں تو اٹھ کر اندر کوٹھڑی میں جا کر لڑکوں سے بات چیت کرنے لگی۔ لیکن اُس کے لڑکے کی نگاہیں کوٹھڑی کے باہر ادھر ادھر

جھٹک رہی تھیں۔ اچانک وہ رسوئی گھر میں کھڑی ہوئی کسٹم پچھڑھیر گئیں۔ جب آنکھیں چار ہوئیں تو بندرا بن نے سمجھا کہ شاید وہ اشارے سے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ پل بھر کے لئے اس کے جسم میں جسے بجلی کی رو دوڑ گئی ہو اس کا دل ہانگلوں کی طرح اچھل کر پھر پڑ سکون ہو گیا۔ انہوں نے سوچا یہ ناممکن ہے۔ یہ میری آنکھوں کی جھٹول ہے۔

بندرا بن سوچنے لگا کہ اچانک کبھی سامنا ہو جانے پر جو گھونگھٹ نکال کر جلدی سے سامنے سے چلی جاتی ہے۔ میرے متعلق جس کی بے توجہی کی بات کئی بار کنج تاتھ سنا چکا ہے، وہ کیا مجھے کبھی اپنی مرضی سے اپنے پاس بلائیگی؟ یہ کبھی ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ بندرا بن نے اپنی نگاہ دوسری جانب پھیر لی۔ لیکن وہ وہاں بھی نہ ٹھیر سکی۔ جس جگہ آنکھیں چار ہوئیں تھیں پھر اُسی طرف چلی گئی، کسٹم اُسی کی طرف دیکھ رہی ہے اُس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

برنما بن نے لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں سے رسوئی گھر کے دروازے کے پاس آ کر میٹھی آوازیں پوچھا: ”مجھے بلایا ہے؟“

کسٹم نے بھی اُسی طرح میٹھی آوازیں کہا: ”ہاں“

بندرا بن نے ذرا آگے بڑھ کر پوچھا: ”کیوں؟“

کسٹم نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر بھاری گلے سے کہا: ”میں تم سے یہ پوچھتی ہوں۔ کہ ہمارے جیسے غریب و کمپوں کو اس طرح ستانے میں تمہارے جیسے بڑے آدمیوں کی کونسی بہادری ہے؟“

ہیں! اچانک یہ کیسا الزام! بندرا بن چُپ چاپ کھڑے رہے۔
 کسٹم نے اور زیادہ سخت آواز میں کہا: ”کیا تم جانتے نہیں ہو
 کہ ہم لوگ کس طرح دن کاٹتے ہیں؟ پھر کیوں بھیا سے ایسی ہنسی کی؟
 کیوں اتنے آدمیوں کو لے کر کھانے کے لئے آ گئے؟“

پہلے تو بندرا بن کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس شکایت کا کیا جواب دے،
 لیکن وہ متین و حلیم آدمی ہیں، کسی بات سے بھی زیادہ نہیں گھبراتے۔
 تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو سمجھال کر
 بڑی سنجیدگی اور ملائمت سے پوچھا: ”کنج بھیا کہاں ہیں؟“
 کسٹم نے کہا: ”معلوم نہیں، مجھ سے کچھ کہے سُنے بغیر ہی صُبح اُٹھ کر
 کہیں چلے گئے ہیں؟“

بندرا بن نے تھوڑی دیر تک چُپ رہنے کے بعد کہا: ”اچھا،
 وہ گئے تو جانے دو۔ میں تو ہوں۔ کیا گھر میں کھانے پینے کو کچھ بھی
 نہیں ہے؟“

”نہیں، کچھ بھی نہیں۔ سب چیزیں ختم ہو گئی ہیں۔ اور ایکسپنس
 بھی اس وقت میرے پاس نہیں؟“

بندرا بن نے کہا: ”اس گاؤں میں تمہاری طرح مجھے بھی سب لوگ
 جانتے ہیں۔ میں سب چیزیں خرید کر نوکر کے ہاتھ بھجوا دیتا ہوں۔
 مجھے ایک انگوچھا دیدو۔ میں ابھی نہا کرتا ہوں۔ اگر ماں دریافت
 کریں، تو کہہ دینا نہا نے گئے ہیں۔ اب تم یہاں کھڑی نہ رہو۔ جاؤ؟“

کسٹم نے کوٹھڑی سے انگو چھالاکر دے دیا۔
 انگو چھاسر پر پیٹتے ہوئے بندرا بن نے ہنس کر کہا ”مٹم کبج بھیا
 کی بہن ہو، اسی لئے وہ تمہیں اس طرح چھوڑ کر بھاگ سکے ہیں۔ اگر اور
 کوئی ہوتیں، تو شاید اس طرح نہ چھوڑ سکتے۔“

کسٹم نے بہت آہستہ سے جواب دیا۔ ”سب لوگ تو
 اس طرح نہیں چھوڑ سکتے، لیکن بعض نہایت آسانی سے چھوڑ سکتے ہیں۔“
 یہ کہہ کر کسٹم نے آڑ میں سے بندرا بن کی جانب دیکھا کہ اس بات
 نے اُس کے دل پر کتنی چوٹ پہنچائی ہے۔

بندرا بن نے دہاں سے چلنے کے لئے پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ پھر
 ترک کر آہستہ سے کہا۔ ”تمہارا یہ دم شاید کسی دن دُور
 ہو جائیگا۔ بچپن میں اپنی ماں کے کسی قصور کے لئے جس طرح تم ذمہ وار
 نہیں ہو، اُسی طرح اپنے پتا کی بھول کے لئے میں بھی ذمہ دار نہیں ہوں۔
 خیر چلنے دو، ان سب جھگڑوں کا ابھی وقت نہیں آیا، جاؤ اور کھانیکا
 انتظام کر دو۔“

کسٹم نے کہا۔ ”بھلا بتاؤ، میں کھانے کا کیا انتظام
 کروں؟ اگر اپنا سر کاٹ کر بچاؤں اور اُس سے تمہارا لپٹ بھر سکے، تو
 کہو میں وہ بھی کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

بندرا بن دوچار قدم چل کر پھر لوٹ آیا۔ اس بات کا کوئی جواب
 نہ دے کر اپنی آواز اور بھی مدھم کر کے بولا۔ ”تمہاری جو خواہش ہے

کہہ سکتی ہو۔ مجھے تو برداشت کرنا ہی پڑیگا۔ لیکن غصے میں آکر اسی طرح اپنی ساس سے کوئی تلخ بات نہ کہہ دینا۔ انہیں ذرا سی بات بھی بہت لگتی ہے۔“
 کسٹم نے غصے بھرے گلے سے کہا: ”میں کوئی جانور نہیں ہوں۔ مجھ میں بھی قصور ہی بہت عقل ہے۔“

”یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں کہ عقل کی نسبت تم میں غصہ ذرا زیادہ ہے۔“ ہاں کسٹم ایک بات اور بھی ہے۔ ماں صبر نہا کر چلی آئی ہیں۔ ابھی تک انہوں نے پوچھا یا ٹھک کچھ بھی نہیں کیا۔ اُن سے پوچھو اور سب سے پہلے اُس کا انتظام کر دو۔ میں جانتا ہوں۔“
 ”جھاؤ، لیکن دیکھو کہیں گپ شپ اُڑانے نہ بیٹھ جانا۔“

بندربان نے کچھ منٹے ہوئے کہا: ”نہیں۔ لیکن جی تو چاہتا رہے کہ دیر کر کے تم سے کچھ جھڑکیاں سنوں۔ اگر تم اور کسی دن کے لئے اُمید دلاؤ تو یہ ہو سکتا ہے کہ آج جلدی لوٹ آؤں۔“

”دیکھا جائیگا۔“ اتنا کہہ کر کسٹم رسوائی گھر کے اندر جا رہی تھی کہ اچانک بندربان نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے میٹھی آواز سے کہا:۔
 ”حیرت ہے، کہ مجھے ایک بار بھی یہ نہیں معلوم ہوا کہ آج تم پہلی دفعہ ہی باتیں کر رہی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا رہے گویا تم مدت سے اسی طرح مجھ پر حکومت کرتی آرہی ہو۔ ایشور کے ہاتھ کا بانہ دھا ہوا کیسا عجیب بندھن ہے کسٹم؟“

کسٹم کھڑی کی کھڑی سُنتی رہی۔ اُس نے کوئی جواب

نہیں دیا ۔

جب ہندو بن چلے گئے ، تو اُن کی یہ آخری بات یاد کر کے اچانک
مُسم کا سارا جسم کانپ اُٹھا ۔ اور وہ رسوائی گھر میں جا کر چُپ چاپ بیٹھ
گئی ۔ اپنی تعلیم کے غرور میں آج تک جسے وہ نا تعلیم یافتہ ، جاہل دیہاتی
سمجھ کر کسی ٹٹا رہی میں نہ لاتی تھی ۔ آج کی بات چیت اور برتاؤ کے بعد
اُس کے متعلق ایک نئی راحت ، نئے لطف اور نئی تمنا سے وہ بیچین
ہوا اُٹھی ۔

تیسرا باب

اُس دن گھر کو ٹہتے وقت بندرا بن کی ماں نے کُسم کو اپنے پاس بلا کر آنکھوں سے محبت کے آنسو بہاتے ہوئے روندھی ہوئی آواز میں کہا: ”بھو! میں تو کہہ ہی نہیں سکتی کہ آج کا دن کتنی خوشی اور راحت میں گزرا ہے۔ بیٹی تم ہمیشہ سُکھی رہو، اتنا کہہ کر انہوں نے اپنے آپ بچل سے ایک جوڑا سونے کے کڑے نکال کر اپنے ہاتھ سے کُسم کے ہاتھ میں پہنا دیئے۔“

بندرا بن کی ماں نے جان لیا تھا کہ کُسم نے آج کھانے وغیرہ کا سب انتظام بندرا بن کی خفیہ امداد ہی سے کیا ہے اور خاص کر اسی وجہ سے اُس کا دل اُمید اور مسرت سے لہریز ہو گیا تھا۔ کُسم نے گلے میں آپ بچل ڈال کر پر نام کیا اور اُن کے پاؤں کی خاک اپنی پیشانی پر لگا کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ ساس اور بھویں اس بارے میں اور کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے بھو سے کہا — ”بیٹی! کبج نا تھ تو

تمام دن دکھائی ہی نہیں دیا — نہ جانے وہ پاگل کہاں بھاگا رہا۔
 کل اُسے ایک بار میرے پاس بھیج دینا“
 کُسم نے ہر ہلا کر کہا: ”اچھا“

ہندرا بن کے دادا نے کُسم میں ”گوزنگ مہا پر بھو“ کی مورتی رکھی
 ہوئی تھی جس کمرے میں وہ مورتی تھی اُس کمرے میں بیٹھ کر ہندرا بن
 کی ماں روزانہ رات کو بہت دیر تک چپ کیا کرتی تھی۔ آج بھی کر رہی
 تھی۔ اُس کا پوتا گود میں بہر رکھ کر سو گیا تھا۔ یہ لوگ جس جگہ بیٹھے تھے۔
 وہاں چراغ کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اسی لئے ہندرا بن اُس کمرے میں آیا تو
 وہ ان لوگوں کو نہ دیکھ سکا۔ وہ مورتی کے پاس گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔
 تھوڑی دیر تک دل ہی دل میں پرار تھنا کر کے اُس نے زمین پر جھکے
 پر نام کیا اور جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اُس کی نظریں پر پڑی۔ وہ
 دل ہی دل میں شرمسار ہو کر ہنس پڑا۔ اور پوچھا: ”ماں تم اتنی
 تاریکی میں کیوں بیٹھی ہو؟“

ماں نے محبت سے جواب دیا: — ”یوں ہی بیٹھی ہوں،
 بیٹا! — تو ذرا میرے پاس بیٹھ جا“ ہندرا بن پاس جا کر بیٹھ گیا۔
 ہندرا بن کے شرمسار ہونے کی ایک وجہ تھی۔ اُس وقت رات
 ایک پہر سے زیادہ گزری چکی تھی۔ اس طرح بے وقت وہ پہلے کبھی مورتی
 کے درشن کرنے کے لئے نہیں آتا تھا۔ آج وہ ٹھا کر جی کے سامنے اس
 بے پائین مُسترت کا اظہار کرنے آیا تھا جو کُسم سے ملاقات کے بعد اس کے

دل کو لگدلا رہی تھی، لیکن کہیں ماں قیاس سے اس کے دل کی بات نہ جان لے، اس شرم سے وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

نٹھوڑی دیر بعد سوئے ہوئے پوتے کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
 بندرا بن کی ماں نے محبت سے لبریز آواز میں کہا — ”اپنے خاندان
 کے اس اکلوتے چشم و چراغ کو چھوڑ کر کہیں جانے کے لئے ایک قدم
 بھی نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن آج مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے بندرا بن جیسے
 میرے سر پر سے کسی نے بھاری بوجھ اتار دیا ہو۔ بیٹا! اب تم
 اُسے جلد اپنے گھر لے آؤ۔ تاکہ میں اس کے ہاتھ سب کچھ سونپ کر
 ذرا چھٹی پاؤں۔ اور کچھ دن کاشی اور بندرا بن گھوم پھراؤں۔“

آج بندرا بن کے دل میں بھی اُمید اور یقین کا دیرسا ہی دریا بہہ رہا
 تھا۔ پھر بھی اُس نے شرماتے ہوئے کہا — ”ماں،
 وہ آئیگی کیوں؟“

ماں نے استقلال اور یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہا —
 ”کیوں آئیگی کیوں نہیں؟ وہ آئیگی تو مجھے چھٹی ملے گی۔ بندرا بن
 یہ میری بھول تھی جو میں اتنے دن وہاں خود نہیں گئی۔ اتنے وقت میں
 اسے اپنے ہاتھ کے سونے کے کڑے پہنا کر آشیر وا دیا اور وہ میرے
 پاؤں کی مٹی ماتھے پر لگا کر چپ چاپ گھڑی ہو گئی۔ اُسی وقت
 میں نے سمجھ لیا کہ اب میرے سر سے بوجھ اتر گیا۔ تم
 دیکھ لینا، اب سب سے پہلا جو اچھا دن آئیگا، اُسی دن میں گھر کی

لکشی گھر لے آؤنگی۔“

بندرا بن نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا —
 ”لیکن وہ آکر تمہارے خاندان کے اس چشم و چراغ کو دیکھے گی تو؟“
 ماں نے جواب دیا — ”دیکھے گی تو کیا؟ میرے دل میں تو
 ایسا کوئی اندیشہ نہیں؟“

”کیوں اندیشہ کیوں نہیں ہے؟“

”بیٹا! میں سونا پہچانتی ہوں — ابھی یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ
 بالکل کھرا سونا ہے، لیکن یہ بات یقیناً کہہ سکتی ہوں کہ پتل نہیں ہے۔
 ملمع بھی نہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی، تو میں اسے اپنے گھر میں لانے کا
 نام بھی نہ لیتی، ہاں بندرا بن کیا ہو تم سے ہمیشہ باتیں کیا کرتی ہے
 ”نہیں ماں، کبھی نہیں۔“ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آج مصیبت
 میں گرفتار ہو کر ہی — ”یہ کہہ کر وہ کچھ ہنسا اور خاموش ہو گیا۔
 ماں نے تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد کچھ سنجیدگی سے کہا
 — ”بیٹا یہ ٹھیک ہے۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ سب ہی
 ایسا کرتے ہیں۔ جب آدمی مصیبت میں پڑتا ہے، تو جو حقیقت میں اپنا ہوتا
 ہے اُسی کے پاس دوڑ کر جاتا ہے۔ میں تو عورت ہوں، پھر بھی، اُس
 اپنے دکھ کی بات مجھ سے نہیں کہی، تمہیں سے کہی؟“

بندرا بن چپ چاپ سُنتے رہے۔

ماں نے پھر کہا — ”ابھی مجھے ایک کام اور کرنا ہے۔ اور وہ

یہ کہ گنج ناتھ کی بھی شادی ہو جائے۔“

یہ کہہ کر وہ آپ ہی آپ ہنس پڑیں۔ آخر اہولیس ————— ”وہ بھی خوب ہے۔ محلے بھر کو دعوت دے کر آپ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ پیچھے جو ہو سو ہو۔“

بند رابن چپ چاپ ہنسنے لگا۔

ماں نے کہا ————— ”سنا ہے بہو سے بہت ڈرتا ہے۔ بڑا بھائی ہے، پھر بھی چھوٹے بھائی کی طرح رہتا ہے۔ بعض ہستیاں پیدائشی حکمران ہوتی ہیں۔ اُن سے ڈرے بغیر کام ہی نہیں چلتا، چاہے آدمی عمر میں اُن سے بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ ہماری بہو بھی اُسی مادہ سے بنی ہوئی ہے۔ بہت ہی شانت پھر بھی سخت۔ میں بھی ایسی ہی چاہتی ہوں کہ اُس پر کوئی بوجھ لا دیا جائے تو وہ اُسے اُٹھاسکے۔ جب ہی تو میں گھر گریستی چھوڑ بیفکر ہو کر کہیں باہر جا سکونگی؟“

تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ پھر کہہ اُٹھیں —————
”میں تو کہہ ہی نہیں سکتی کہ ایک ہی دن کی بات چیت اور دیکھنے سُننے سے میں اُسے کتنا چاہنے لگی ہوں۔ شام سے برابر یہی سوچ رہی ہوں اُسے کب اپنے گھر لاؤں۔ کب اُسے پھر دیکھوں۔“

بند رابن دل ہی دل میں شرمیلے لگے۔ وہ اُس بات کو دہانے کی غرض سے بولے۔ ”ہاں ماں گنج ناتھ کی کیا بات کہہ رہی تھیں؟“
ماں نے کہا ————— ”ہاں، وہ بات تو رہی گئی تھی۔ بہو کو

چوتھا باب

کلچ ناتھ کے بیاہ کی، لین دین کی اور کھالے پلانے تک کی سب باتیں بالکل طے کر کے بندرا بن کی ماں تیسرے پہر گھر لوٹ آئیں ۛ اُسوقت چند ہی منڈپ کے سامنے سے لڑکے ایک قطار میں کھڑے ہو کر ہمارے پڑھ رہے تھے اور بندرا بن ایک طرف کھڑے سن رہے تھے۔ جیسے ہی بیل گاڑی سامنے آ کر رُکی، فوراً اُن کا چھوٹا سالار کا چرن اُس پر سے اتر کر شور مچاتا ہوا اپنے پیتا کے پاس آ پہنچا۔ آج وہ بھی اپنی وادی کے ساتھ اپنے لئے ممافی تلاش کرنے گیا تھا۔ بندرا بن اُسے گود میں لے کر گاڑی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ ماں اُسوقت گاڑی سے اتر ہی رہی تھیں اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر بولے —
 ”کیوں ماں، کب کا مہورت ٹھیرا؟“

”بس اسی مہینے کے آخر میں — اب زیادہ دن نہیں ہیں — تم اندر چلو بہت سی باتیں کرنی ہیں“ اتنا کہہ کر وہ ہنستی ہوئی اندر

چلی گئیں۔ وہ اس خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی تھیں کہ اب میرے گھر ہو آئیگی۔ اس کے علاوہ کُسم کو اس دن گھر گریہتی کے کام میں ماہر دیکھ کر وہ اسے بہت ہی چاہنے لگی تھیں۔ اور صاف دیکھ رہی تھیں کہ اب میں بھی سُکھی ہو جاؤنگی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو سُکھی دیکھونگی اور ہو کو گھر گریہتی سوئپ کر آرام سے یا تر کرنے کے لئے باہر جاسو گئی۔ اسی وجہ سے اب اُن کے لئے سب کام آسان ہو گئے تھے۔ اسی لئے وہ گوکل کی دودھوا استری کے سب مطالبات منظور کر کے شادی کا تمام خرچ اپنے ذمے لے کر اور بات بالکل پختہ کر کے آئی تھیں۔

اُس وقت تک انہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ بندہ ابن جانتے تھے کہ ماں کہیں جا کر بھوجن کرنے کے لئے جلدی تیار نہیں ہونیں۔ انہوں نے پاٹھسالہ کے لڑکوں کو چھٹی دیدی اور اندر آ کر دیکھا کہ وہ رسوئی بنانے کا کوئی انتظام کرنے کی بجائے ایک طرف خاموش بیٹھی ہیں۔

بندہ ابن نے کہا۔۔۔۔۔ ”ماں، بھوکا رہ کر سوچنے سے سب کچھ گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی فکر بعد میں کرنا۔ پہلے اپنے کھانے کی فکر کرو“۔

ماں نے کہا۔۔۔۔۔ ”اب رسوئی شام کو ہوگی۔ بیٹا! میں ہنسی نہیں کرتی۔ اب وقت بالکل نہیں ہے۔ اُس پائل کے پاس نہ تو روپیہ پیسہ ہے اور نہ آدمی ہیں۔ سب کچھ ہمیں لوگوں کو کرنا

پڑے گا۔ لڑکی کی ماں تو بہت ہی چالاک اور کڑی ہے۔ جلدی کسی بات پر راضی ہونا تو جانتی ہی نہیں۔ لیکن میں بھی تو چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ارے لو، یہ بھی آگیا۔ تمہاری عمر ہزار برس کی ہو بیٹا، ابھی تمہاری ہی بات ہو رہی تھی۔ آؤ بیٹھو۔ یکایک اس وقت کیسے چلے آئے؟
درہل ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں کسی کے گھر جانے کا یہ وقت نہیں تھا۔

کنج ناتھ کمرے میں پہنچتے ہی اس طرح کی آؤ بھگت دیکھ کر پہلے تو سٹپٹا گیا۔ پھر کچھ کھویا ہوا سا پاس جا کر پر نام کر کے بیٹھ گیا۔
بندرا بن نے مذاق کرتے ہوئے کہا — ”کیوں کنج بھیا تمہیں خبر کیسے ملی؟ رات بھر کے لئے بھی خاموش نہیں بیٹھ سکے؟ ارے کل صبح ہی آکر سن لیتے تو کیا ہرج تھا؟“
بندرا بن کی ماں بھی کچھ مسکرائی۔ لیکن کنج کا دھیان اُن کی طرف نہیں گیا۔ اُس نے آنکھیں چڑھا کر کہا — ”باپ رے! بیگنی بہن ہئے یا داروغہ!“

بندرا بن نے منہ پھیر کر ہنسی چھپائی۔ اُن کی ماں نے ہنسی روک کر پوچھا — ”معلوم ہوتا ہے ہونے کچھ کہہ کر بھیجا ہے؟“
کنج ناتھ نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سنجیدہ ہو کر کہا — ”بھلا ماں! تمہاری بھی یہ کیسی بھول ہے! مان لو اگر کسم کی نگاہ نہ پڑتی، کسی اور کی نگاہ جا پڑتی تو پھر تمہیں بتاؤ کیا ہوتا؟“

ماں اُس کی بات کا مطلب نہ سمجھ کر پچھنی سے اُس کی جانب
دیکھتی رہ گئیں ۛ

پندرہ راتیں نے پوچھا — ”کنج بھیا! بتاؤ تو آخر بات کیا ہے؟“
فوراً ہی بتا کر کنج اپنے آپ کو ہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے
اُس نے پندرہ راتیں کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور ماں سے کہا —
پہلے یہ بتاؤ کہ کیا کھلاؤ گی؟ پھر بتلاؤں گا ۛ

اس پر ماں ہنس پڑی اور بولیں — ”بیٹا یہ تو اور بھی اچھی
بات ہے۔ یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ بتاؤ کیا کھاؤ گے؟“
کنج نے کہا — ”اچھا یہ پھر کسی دن دیکھا جائیگا۔ پہلے یہ بتاؤ
کہ تمہاری کون سی چیز کھو گئی ہے؟“

پندرہ راتیں کی ماں بھی متفکر ہوئی — تھوڑی دیر ٹھیر کر مدھم
آواز سے بولیں — میری تو کوئی چیز گم نہیں ہوئی ۛ
یہ سن کر کنج قہقہہ لگا کر ہنس پڑا — پھر اُس نے اپنے دوپٹے
میں سے ایک جوڑی سونے کے کڑے نکالے اور کہا — ”تو کیا
یہ کڑے تمہارے نہیں ہیں؟ یہ کہہ کر کنج بڑے زور سے قہقہہ لگا کر آپ
آپ ہی ہنسنے لگا ۛ

یہ وہی کڑے تھے جو کل ٹھیک اسی وقت پندرہ راتیں کی ماں نے بڑی
محبت سے اپنی بہو کے ہاتھوں میں پہنا کر اُسے آشیر واد دیا تھا۔ آج
وہی کڑے، وہی آشیر واد، کسٹم نے اپنے ناسمجھ بھائی کے ہاتھ لوٹا دیئے

پس ۛ

بند رابن نے چند منٹ اس طرف دیکھ کر جب اپنی ماں کے چہرے کی جانب آنکھ اٹھائی تو وہ ڈر گیا۔ تیسرے پہر کی پھینکی روشنی میں وہ کسی مُردے کے چہرے کے مانند زرد دکھائی دیتا تھا۔ — بند رابن کے دل میں اُس وقت کیا ہو رہا تھا، یہ انتر پامی ہی جانتے ہیں۔ لیکن انہوں نے لمحہ بھر میں ہی بڑی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ماں کے کچھ اور نزدیک ہو کر بہت ہی سیدھے سادے الفاظ میں بڑی سنجیدگی سے کہا۔ — ”ماں یہ ہم لوگوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ بھگوان نے ہم لوگوں کی چیز ہمیں کو لوٹا دی۔ یہ تو ہمارے ہاتھ کے کڑے ہیں ماں، بھلا اُس کا مقدر ہے کہ وہ انہیں پہن سکے؟ پھر اُس نے گنج سے کہا۔ — ”چلو بھائی، ہم لوگ باہر چل کر بیٹھیں۔“ اِس کے بعد وہ اُسے ہاتھ پکڑ کر گھینچتے ہوئے باہر لے گئے گنج ٹھیکر سیدھا آدمی اسی لئے، خوشی کے مارے بوقت اتنا راستہ چل کر آیا تھا۔ آج دوپہر کے وقت، اکھاپی پچکنے کے بعد، جب کُسم نے پڑمردہ شکل سے کڑوں کی وہ جوڑی ہاتھ میں لے کر خشک اور مری ہوئی آواز سے کہا۔ — ”کل وہ لوگ یہاں کڑوں کی جوڑی بھول سے چھوڑ گئے ہیں تمہیں انہیں پہنچانے کے لئے ان کے گھر جانا ہوگا،“ تو اسے خوشی کے مارے اِس بات کا موقع بھی نہ ملا کہ وہ اپنی بہن کے پڑمردہ چہرے کی طرف دھیان دیتا ۛ

داؤ بیچ سے وہ واقف نہیں تھا۔ بہن کا کہنا ٹھیک نہیں ہے، یا آدمی، آدمی کو اتنی قیمتی چیز دے سکتا ہے، اور اگر کوئی دے بھی، تو فوراً آدمی اُسے قبول نہیں کرتا، لوٹا دیتا ہے، یہ سب باتیں اُس کے خیال میں ناممکن تھیں۔ اسی لئے وہ راسنہ بھر صرف یہی سوچتا آیا کہ وہ لوگ اچانک اپنی کھوئی ہوئی چیز پا کر کیسے خوش ہونگے، اور مجھے کتنا آشیرواد دیں گے، وغیرہ وغیرہ —

لیکن وہاں، ویسا تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا یا بُرا، یہ بھی تو ٹھیک طرح سے وہ نہیں سمجھ سکا۔ اتنا بڑا کام کر کے بھی بندرابن کی ماں کے مُنہ سے کوئی اچھتی بات کوئی آشیرواد نہ پا کر اُس کا دل بہت اُداس ہو گیا، بلکہ آہستہ آہستہ اُسے اس وجہ سے ایک شرمندگی کا احساس ہونے لگا کہ بندرابن اُن کے سامنے سے مجھے زبردستی باہر کھینچ لائے ہیں۔ وہ شرمندہ اور دُکھی ہو کر خاموش بیٹھا رہا۔ بندرابن نے بھی اُس کے پاس بیٹھ کر کوئی بات نہیں کی۔ اُس وقت اُن کی حالت گفتگو کرنے کے قابل ہی نہ تھی۔ اُن کا دل بے عزتی کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ بے عزتی اُن کی اپنی بے عزتی نہیں اُن کی ماں کی تھی ۞

انہیں اپنے بھلے بُرے یا مان اہمان کا کوئی خیال نہ تھا۔ جس طرح موت کی اذیت باقی سب اذیتوں پر غالب آ جاتی ہے اور اپنے سوا اور کسی قسم کی کوئی تکلیف باقی رہنے نہیں دیتی۔ ماما کے اہمان سے

مُرجھائے ہوئے چہرے پر چھائی ہوئی مُردنی نے بھی بُرندابن کے دل پر
ویسا ہی اثر کیا اور اپنے ذاتی مان اور اپماق کا تصور ہی اس کے ذہن
سے مکل گیا ۛ

شام کی تاریکی اور بھی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ کُنچ نے کہا —
”اچھا بھائی بُندربابن، اب تو میں چلتا ہوں“ ۛ

بُندربابن نے پاگلوں کی مانند کہا — ”اچھا جاؤ، لیکن پھر
کسی دِن ضرور آنا“ ۛ

کُنچ چلا گیا اور بُندربابن وہیں اوندھے مُنہ ہو کر پڑ گئے، وہ سوچنے
لگے کہ ماں کی کیسی کیسی امیدیں، مستقبل کی کیسی کیسی تمناؤں، پل بھر
میں خاک ہو گئیں۔ اب میں کس طرح اُنہیں مطمئن اور شانت کروں؟
اُن کے پاس چل کر تسلی کی کون سی بات کہوں۔ اور سب سے
بڑھ کر لطف یہ کہ جس نے اس طرح تمام اُمیدوں کو خاک میں ملا کر
اُن کی ماما کے شانت اور مطمئن دل کو دُکھ پہنچا یا ہے وہ انکی دھرم پتی
ہے اور اس کو وہ پیار بھی کرتے ہیں ۛ



پانچواں باب

جس طرح کل صرف ایک دن کے میل ملاپ سے ہی کسٹم نے اپنی ساس اور سوامی کو پہچان لیا تھا۔ اسی طرح وہ بھی اسے پہچان گئے ہیں۔ اس بات میں اسے ذرا بھی شک نہ تھا۔ جو اسے پہچانا چاہتے ہیں انہی کے سامنے اپنے آپ کو دن بھر اُبھائے رکھنے سے کسٹم کو ایک خاص قسم کا کُلف اور سرور حاصل ہو رہا تھا اور اس کا دل خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے غیر محسوس طور پر اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ محبت کی ایک نہ لڑنے والی زنجیر میں جکڑ لیا تھا۔

آج اسی زنجیر کو اپنے ہاتھ سے توڑ کر جب کسٹم نے سونے کے کڑوں کی جوڑی لوٹا دینے کے لئے اپنے بے سمجھ بھائی گنج ناتھ کو سوپنی اور وہ اسے لے کر بڑی خوشی سے چل دیا تو لمحہ بھر کے لئے ایک دردناک مایوسی کے ناقابل برداشت بوجھ نے اس کے دل پر غلبہ پالیا۔ وہ

کوٹھڑی میں جا کر رونے لگی۔ جیسے وہ محسوس کر رہی ہو کہ اس کا یہ نفرت انگیز اقدام اُن لوگوں کے لئے انتہائی تکلیف دہ اور ناقابل برداشت ہوگا۔ اور اس کے متعلق ان کے دلوں میں نہ جانے کیا تبدیلی پیدا ہو جائے گی؟ شام کب کی ہو چکی تھی۔ کنج لوٹ آیا تھا۔ اس نے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی کو دیکھ کر اپنی بہن کی کوٹھڑی کے سامنے جا کر بوچھا

————— ”چراغ نہیں جلایا“

کسٹم پھر بھی چُپ چاپ زمین پر بیٹھی رہی لیکن پھر کچھ نادام سی ہو کر اٹھ بیٹھی اور بولی ”ابھی جلا دیتی ہوں، بھیتا تم کب آئے“۔ بس ابھی آ رہا ہوں“ کنج ناتھ چلم میں تمباکو بھرتے ہوئے بولا۔

چراغ میں تیل ڈالنے اور بتی وغیرہ بنانے میں کسٹم کو کچھ دیر ہو گئی جب وہ فارغ ہوئی تو کنج ناتھ جاچکا تھا۔

روز کی طرح آج بھی کسٹم کنج کو کھانا دے کر دُور جا بیٹھی وہ چُپ چاپ کھانا کھانے لگا اور زبان سے کچھ نہ بولا۔ وہ شخص جو حد درجہ باتوئی تھا اور باتوں کے مقابلے میں اور کسی چیز کو بھی پسند نہ کرتا تھا اسے آج اچانک ہی اس طرح خاموش دیکھ کر کسٹم کے دل میں شک و شبہات پیدا ہو گئے۔ اسے اس بات کا تو یقین ہو گیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ لیکن وہ کیا ہے اور کس نوعیت کا ہے یہ جاننے کے لئے اس کی بے قراری بڑھنے لگی۔ اسے خیال ہونے لگا کہ انہوں نے بھیتا کی بہت بے عزتی کی ہے کیونکہ یہ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ چھوٹی موٹی

جے عزتی کو میرا بھائی کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر سمجھ بھی لیتا ہے تو اتنی دیر تک اسے دل میں نہیں رکھ سکتا۔ کھانا کھا کر جب کُنج جانے لگا تو کُسم کے لئے چُپ رہنا ناممکن ہو گیا اس نے میٹھی آواز میں پوچھا
 ”بھیا وہ کُڑے کس کے ہاتھ میں دئے تھے؟“
 کُنج نے حیران ہو کر کہا — ”بھلا اور کس کے ہاتھ دیتا؟ ماں کو پکڑا آیا تھا؟“

”انہوں نے کیا کہا؟“
 ”کچھ بھی نہیں“ کہہ کر کُنج باہر چلا گیا۔
 دوسرے دن کُنج جب پھیر سی کے لئے باہر جانے لگا تو خود ہی کُسم کو پکار کر بولا — ”کُسم تمہاری ساس کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ ایسی چیز ہاتھ میں دے آیا مگر ایک بات بھی نہ بولیں۔ اس سے اچھا تو برنہا بن ہی نکلا جو خوش ہو کر کہنے لگا — ”ماں مقدور ہے کہ کوئی ایسا ویسا آدمی تمہارے کُڑوں کو اپنے ہاتھ میں پہن سکے۔ ہمارے قہمت بہت بلند ہے ماں! اسی لئے بھگوان نے ہم لوگوں کی چیزیں کو لوٹا کر ہمیں خبردار کر دیا ہے۔“

”ہیں! یہ کیا کُسم؟“
 کُسم کا گورا گورا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے زور سے مہرلا کر کہا — ”نہیں، کچھ نہیں، لیکن یہ بات کیا انہوں نے خود کہی تھی؟“

کنج — ”ہاں خود انہوں نے کہی تھی۔ ماں تو منہ سے بولیں ہی نہیں۔ اس کے علاوہ صبح سے ہی وہ نہ جانے کہاں گئیں تھیں، اُسوقت تک نہ کچھ کھایا تھا اور نہ غسل ہی کیا تھا۔ وہ میرے منہ کی طرف ایسے دیکھتی رہیں، جیسے ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا ہو کہ میں نے اپنی کو کیا دیا اور کیا کہا۔“

یہ کہہ کر کنج آپ ہی آپ ایک دو بار گردن ہلا کر تھیلہ سر پر اٹھائے باہر چلا گیا۔

تین چار دن گزر گئے۔ رسوئی ٹھیک نہیں بنی تھی۔ اسی لئے کنج نے کل اوپر پرسوں منہ پھلایا تھا۔ آج کھلم کھلا شکایت کرنے سے بھائی بہن میں جھگڑا ہو گیا۔

کنج رسوئی پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ”کبھی یہ چل جاتا ہے، کبھی وہ خراب ہو جاتا ہے۔ آجکل تمہارا دل کہاں رہتا ہے کسم؟“ کسم نے بھی غصے میں بھر کر جواب دیا ”میں کسی کی زرخیر لوٹدی نہیں ہوں۔ مجھ سے رسوئی نہیں ہوگی۔ جو اچھی رسوئی بنا کر کھلائے اسی کو جا کر لے آؤ۔“

کنج جھوک سے برگشتہ خاطر ہو رہا تھا۔ آج وہ ڈرا نہیں۔ ہاتھ ٹکا کر کہا۔ پہلے تو یہاں سے چلی جا، پھر دیکھنا کہ میں لاتا ہوں یا نہیں۔ اس کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

کسم اُسی دن سے جی بھر کر رونے کے لئے بیچیں ہو رہی تھی۔ آج

موقعہ پاکر اس نے خوب دل کی بھر اس نکالی۔ بھائی کی پروسی ہوئی تھالی پڑی رہی۔ صدر دروازہ ویسا ہی کھلا رہا، اور وہ رسوائی گھر کی چوکھٹ پر بسر رکھ کر اس طرح رونے لگی جیسے کوئی مر گیا ہو ۛ

اُس وقت شاید دس بجے تھے۔ گھنٹے بھر تک خوب اچھی طرح رو دھو کر وہ تھک کر سو گئی۔ اچانک اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ بند رابن آنگن میں کھڑے کنج بھیا کہہ کر پکار رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک پانچ چھ برس کا موٹا تازہ اور خوبصورت بچہ کھڑا تھا۔ کسٹم نے گھبرا کر گھونگھٹ کھینچ لیا اور جلدی سے کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ اُس وقت وہ سب کچھ بھول کر کواڑ کے سوراخوں میں سے ٹکٹکی لگائے اُسی حسین بچے کی طرف دیکھ رہی تھی ۛ

اُس نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ میرے پتی کی اولاد ہے دیکھتے دیکھتے اچانک اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور اُس کے دونوں ہاتھ گویا ہزار ہا تھبن کر اُسے چھین لینے کے لئے آگے بڑھنے لگے لیکن نہ تو وہ آواز ہی دے سکی اور نہ اُس طرف قدم ہی بڑھا سکی۔ صرف پتھر کے بُت کی مانند ٹکٹکی لگائے اُس بچے کی جانب دیکھتی رہی۔ کسی کی بھی آہٹ نہ پا کر بند رابن بڑے حیران ہوئے آج صبح ہی وہ اپنے کسی کام سے ادھر آئے تھے۔ اور کام بٹا کر لوٹ رہے تھے۔ دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے۔ اس خیال سے کہ کنج گھر میں ہو گا گاڑی سے اتر کر اندر چلے آئے تھے۔ کنج سے انہیں ضروری کام تھا۔ بیل گاڑی تیار

ہوتی دیکھ کر اُن کا لڑکا بھی سوار ہو گیا تھا اس لئے وہ بھی اُن کے ساتھ
تھا ۛ

بندرا بن نے پھر بیکارا — ”کیا کوئی گھر میں نہیں ہے؟“

اس پر بھی کوئی جواب نہیں ملا ۛ

چرن نے کہا — ”بابو جی بڑی پیاس لگی ہے۔ پانی پینو لگا“

بندرا بن نے دھمکاتے ہوئے کہا ”نہیں، پیاس نہیں لگی،

جاتے وقت ندی پر پینا“ ۛ

بچارہ بچہ منہ بسور کر چُپ رہ گیا ۛ

اُس دن تو کسٹم شرم کے جذبات پر قابو پا کر کھلم کھلا بندرا بن
کے سامنے آ گئی تھی۔ اور ضروری بات چیت بھی آسانی سے کر لی
تھی، لیکن آج نہ جانے کیوں اس کا تمام جسم شرم سے پانی پانی ہونے
لگا۔ اگر چرن نے پانی نہ مانگا ہوتا تو آج شاید وہ کسی طرح بھی باہر نہ
نکل سکتی۔ پہلے تھوڑی دیر تو اُسے پس و پیش ہوا، لیکن پھر اُس نے
ایک چھوٹا سا آسن لاکر برآمدے میں بچھا دیا اور پاس آ کر چرن کو گود
میں اٹھا کر چُپ چاپ اندر چلی گئی ۛ

بندرا بن نے یہ اشارہ تو سمجھ لیا، لیکن اُس کی سمجھ میں بات نہ
آئی مگر چرن کیا سوچ کر بغیر کچھ کہے سُنے چُپ چاپ ایک اجنبی عورت کی گود
میں چلا گیا ہے۔ ادھر چرن حیران سا ہو گیا۔ ایک تو ابھی اُس نے
اپنے پیتا کی گھر کی کھائی تھی۔ اُدھر سے ایک بالکل اجنبی جگہ میں نہ

جانے کون کہاں سے آکر اُسے اس طرح اٹھالے گیا۔ یہ اس کا پہلا تجربہ تھا اس سے پہلے کسی نے اسے اس طرح نہ اٹھایا تھا۔

کُسم نے چرن کو اندر لے جا کر بتائے دیئے، تھوڑی دیر تک ٹپٹکی لگا کر اُس کی جانب دیکھا اور پھر اچانک بڑے زور سے اُسے چھاتی سے چٹا کر رونا شروع کر دیا۔

چرن جب اُس کے بازوؤں کی کڑی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگا، تو کُسم نے اُس پر پوچھ کر کہا: یہ کیا بیٹا، میں تو تمہاری ماں ہوں!

کُسم ہمیشہ سے بچوں کو چاہتی تھی۔ اگر کبھی کوئی بچہ اُس کے ہاتھ میں آجاتا، تو وہ جلدی اُسے چھوڑتی ہی نہ تھی، لیکن آج تو اسے کل سنسار کو اپنی آغوش میں لینے کی خواہش ہو رہی تھی۔ ماما کی اتنی شدید آندھی اس کے دل میں پہلے کبھی نہ اٹھی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی۔ چھین تندرست اور موٹا تازہ بچہ میرا ہی ہو سکتا تھا، لیکن کیوں نہ ہو! کس نے یہ کاوٹ ڈالی؟ اولاد سے محروم کرنے کا یہ ظالمانہ حق دُنیا کو کیوں ملا۔ وہ چرن کو بتاتا بھی اپنی چھاتی سے چٹاتی تھی، اُتنا ہی اُس کا شفقت مادری سے محروم دل زیادہ بچپن ہو رہا تھا۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی دولت کسی نے نہ بردستی اور غیر منصفانہ طریق پر اُس سے چھین لی ہے۔ چرن کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ اگر یہ وہ پہلے جانتا تو شاید زندگی پر جا کر ہی پانی پیتا۔ کُسم کا اظہار محبت اس کے

لئے پیاس کی شدت سے زیادہ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ آخر اُس۔
تنگ آکر کہا — ”چھوڑ دو“

کُسم نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اُس کا مُنہ لے کر کہا —
”ماں کہو، تب چھوڑوں گی“

چترن نے سر ہلا کر کہا — ”نہیں“

”تو پھر نہیں چھوڑوں گی“ یہ کہہ کر کُسم نے اُسے پھر زور سے چھایا
کے ساتھ چٹا لیا۔ اور پیار سے اس کا مُنہ چوم کر کہا ”ماں نہ کہو گے،
کسی طرح بھی نہ چھوڑوں گی“

چترن نے رونی سی شکل بنا کر کہا — ”ماں!“
اب تو چترن کو چھوڑنا کُسم کے لئے اور بھی مُشکل ہو گیا۔ وہ اُسے اپنے
چھاتی سے چٹا کر رونے لگی۔

دیر ہو رہی تھی۔ باہر سے بند رابن نے کہا — ”ارے چرا
تُو نے پانی پی لیا؟“

چترن نے روتے ہوئے کہا — ”یہ تو چھوڑتی ہی نہیں
کُسم نے آنسو پونچھ کر روندھے ہوئے گلے سے کہا —
”آج چترن میرے پاس رہیگا“

بند رابن نے دروازے کے پاس آکر کہا — ”بھلاہ
کیسے رہ سکیگا؟ اور اُس نے ابھی تک کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ مار
بہت گھبرائے گی“

”کُسم نے اُسی طرح جواب دیا۔۔۔۔۔“ نہیں وہ یہیں رہے گا۔ آج میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔“

بندر ابن نے پوچھا۔۔۔۔۔ ”کیوں کیا ہوا ہے؟“
 کُسم نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”مُم کاڑھی لوٹا دو، دیر بہت ہو گئی ہے۔ میں ندی پر جا کر چرن کو اشنان کراتی ہوں۔ یہ کہہ کر کُسم کسی قسم کے جواب کا انتظار کئے بغیر اُگڑ چھا اور تیل کی کٹوری ہاتھ میں لے کر چرن کو گود میں لئے ہوئے ندی کو چلی گئی۔“

گھر کے ساتھ ہی چھوٹی سی شفاف پانی کی ندی بہتی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی چرن خوش ہو گیا۔ اُس کے گاؤں میں ندی نہیں، ایک چھوٹا سا کچّا تالاب ہے۔ جس میں کوئی اسے اُترنے نہیں دیتا تھا، گھاٹ پر بیٹھ کر اُس نے تیل ملا اور پھر وہ گھٹنوں تک پانی میں کود پڑا۔ جب اُچھل کود کے بعد اشنان کر کے کُسم کی گود میں سوار ہو کر گھر لوٹا تو ماں بیٹے میں ایک عجیب پریم کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ کُسم لڑکے کو گود میں لئے ہوئے سامنے آئی۔ اُس کا سارا منہ کھلا تھا۔ جاتے وقت وہ طبیعت خراب ہونے کی بات کہہ گئی تھی لیکن اب تو اُس کے چہرے پر دکھ یا تکلیف کا نشان بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ بلکہ تازہ کھلے ہوئے گلاب کی مانند اُس کے ہونٹ دبی مسکراہٹ سے کھلے پڑتے تھے اُس کی گفتار میں کسی طرح کے پس و پیش، شرم یا ہچکچاہٹ کا نشان موجود

نہ تھا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا — ”اچھا اب تم جاؤ اور
اشنان کر آؤ“

”اُس کے بعد؟“

”کھانا ہوگا“

”اُس کے بعد؟“

”کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرنا“

”پھر اُس کے بعد؟“

”جاؤ میں نہیں جانتی۔ لو انگو چھالو اور دیر مت کرو“

یہ کہہ کر کُسم نے ہنستے ہنستے انگو چھے کو بند رابن کے اوپر پھینک دیا۔

بند رابن نے انگو چھا پکڑ لیا، اور منہ پھیر کر ایک لمبی سرخ آہ بھر کر

کہا — ”بلکہ تم ہی دیر نہ کرو۔ چرن کو کچھ کھلا پلا دو۔ مجھے گھر جانا ہی
ہوگا“

”کیوں جانا ہوگا؟ گاڑی کے لوٹ جانے پر ماں خود ہی سمجھ

جائیں گی“

”ٹھیک اسی لئے گاڑی نہیں لوٹانی ہے۔ وہ آگے بڑکے نیچے

کھڑی ہے“

یہ سن کر کُسم کا ہنستا ہوا چہرہ اُداس ہو گیا۔ تھوڑی دیر سوکھے منہ

سے بند رابن کی طرف دیکھ کر اس نے کہا ”پھر تو ماں سے بغیر پوچھے

تمہارا یہاں آدھی ٹھیک نہیں ہوا“

کُسم کی گفتگو کا انداز پہچان کر بندرا بن ہنس پڑے۔ لیکن اُس ہنسی میں آنسو نہیں تھا۔ سنجیدگی سے بولے ”کُسم میری پورش کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ ماں کے حکم کے بغیر اس گھر میں تو کیا اس گاؤں میں بھی پاؤں نہیں رکھ سکتا۔ لیکن خیر، جانے دو۔ جو بات ہو گئی ہے اُسے پھر سے اٹھانے میں کسی بھی طرف کا کوئی فائدہ نہیں، نہ تمہارا نہ میرا۔ جاؤ اب دیر نہ کرو“ یہ کہہ کر بندرا بن پھر آسن پر بیٹھ گئے۔

کُسم بڑی مشکل سے آنسو روک کر چپ چاپ نیچا منہ کئے لڑکے کو لے کر کوٹھڑی میں چلی گئی۔ گھنٹے بھر بعد جب دونوں باپ بیٹا گاڑی پر بیٹھ کر گھر لوٹ رہے تھے۔ تو راستے میں چرن نے پوچھا ————— ”بابو جی، ماں اتنی روتی کیوں تھیں؟“

بندرا بن نے حیران ہو کر پوچھا ”کیوں رے، تجھے یہ کس نے کہا کہ وہ تیری ماں ہے؟“

چرن نے زور دیتے ہوئے کہا ”وہ میری ماں ہی تو ہیں۔ کیا وہ ماں نہیں ہیں؟“

بندرا بن نے اس بات کا کوئی جواب نہ دے کر پوچھا ————— ”تو اپنی ماں کے پاس رہ سکتا ہے؟“

چرن نے بہت خوش ہو کر سر ہلاتے ہوئے کہا ————— ”ہاں،

”رہ سکتا ہوں۔“
 ”اچھا“ کہہ کر بند راہن گاڑی میں ایک طرف مُنہ کر کے لیٹ گئے اور
 سورج کی کرنوں سے تپے ہوئے شفاف نیلے آسمان کی جانب دیکھنے
 لگے۔

دوسرے دن تیسرے پہر پانی لانے کے لئے ندی پر جاتے وقت
 کُسم اپنے صدر دروازے کی شکنی لگا رہی تھی، کہ بارہ تیرہ سال کے
 ایک لڑکے نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پاس آ کر پوچھا —
 ”تم کونج ویراگی کا مکان بتا سکتی ہو؟“

کُسم نے کہا — ”ہاں بتا سکتی ہوں، کہاں سے آئے ہو؟“
 ”ہاڈل گاؤں سے پنڈت جی نے چٹھی دی ہے۔“ یہ کہہ کر اُس
 نے اپنے میلے دوپٹے سے چٹھی کھول کر دکھائی۔
 کُسم کی رگوں کا خون اُبل پڑا۔ دیکھا اُس پر اُس کا اپنا نام
 ہے۔ چٹھی کھول کر دیکھی۔ بہت طویل لکھی ہوئی تھی — خود
 بند راہن کے ہاتھ کی۔

خط کا مضمون پڑھنے کے زبردست اشتیاق کو بشکل دبا کر وہ
 لڑکے کو بلا کر اندر لے گئی اور اُس سے پوچھا — ”تم، پنڈت جی
 کسے کہہ رہے تھے؟ تمہیں چٹھی کس نے دی؟“
 لڑکے نے حیران ہو کر کہا — ”پنڈت جی نے دی۔“
 کُسم کو باٹھشالہ کا حال معلوم نہ تھا۔ اس لئے وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔

اُس نے پوچھا — ”تم چرن کے پتا کو جانتے ہو؟“
 ”ہاں جانتا ہوں — وہی تو پنڈت جی ہیں؟“
 ”تم اُن سے پڑھتے ہو؟“

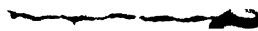
”میں پڑھتا ہوں اور پانٹھ سالہ میں اور بھی بہت سے لڑکے
 پڑھتے ہیں؟“

کسٹم کا اشتیاق اور بھی بڑھا اور اُس نے کئی سوال کر کے اُس
 کے متعلق سب باتیں جان لیں۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ پانٹھ سالہ پنڈت جی
 کے گھر میں ہی قائم ہے۔ اُس میں لڑکوں کو فیس نہیں دینی پڑتی۔
 پنڈت جی اپنے پاس سے لڑکوں کو کتا ہیں، سیلیٹیں، پنسلیں وغیرہ
 خرید دیتے ہیں۔ جن غریب لڑکوں کو دن کو وقت نہیں ملتا، وہ شام
 کے وقت پڑھنے آتے ہیں۔ اور جب ٹھا کر جی کی آرتی ہوتی ہے،
 تو ہر سادے کرہنتے کھیلنے اپنے اپنے گھر لوٹ جاتے ہیں۔ دو لڑکے
 عمر میں بڑے بھی ہیں جو پانٹھ سالہ میں انگریزی پڑھتے ہیں، یہ سب
 باتیں کسٹم نے جان لیں اور لڑکے کو بتا شے دے کر رخصت کر دیا۔
 اس کے بعد وہ چٹھٹی کھول کر پڑھنے لگی۔

کسٹم کا مسکھ کا خواب گویا کسی نے دھٹکا دے کر ختم کر دیا۔ چٹھی
 اُسی کو لکھی گئی تھی۔ لیکن اُس میں اُس کو کسی طرح سے بھی مخاطب نہ
 کیا گیا تھا۔ محبت کی کوئی بات نہیں تھی، یہاں تک کہ ”آشیر واد“
 تک موجود نہیں تھی۔ اور یہ ان کا پہلا خط تھا۔ اگرچہ اس سے

پہلے اور کسی نے اُسے کبھی کوئی خط نہ لکھا تھا۔ لیکن اُس نے اپنی سکھی
 سیلیوں کے کئی خط دیکھے تھے۔ اُن چٹھیوں اور اس چٹھی میں میں کتنا بڑا
 فرق تھا۔ اس میں شروع سے لے کر آخر تک صرف کام ہی کی باتیں
 تھیں۔ موضوع ہے کنج کے بیاہ کی بات۔ یہی بات کہنے کے لئے وہ کل
 آئے تھے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ ماں نے کنج ناتھ کے بیاہ کی بات جیت
 پختہ کر لی ہے۔ اور بیاہ کا سارا خرچ بھی وہ اپنے پاس سے دینگے، حال
 میں یہ بیاہ ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے کنج ناتھ کی اور اُس کے ساتھ
 خود کسٹم کی بھی دنیاوی تکالیف دور ہو جائیں گی یہ اشارہ خط میں خاص
 پر کیا گیا تھا۔

ایک بار ختم کرنے کے بعد اُس نے خط کو ایک بار پڑھنے کی بھر
 کوشش کی، لیکن اس بار سب الفاظ جیسے اُس کی آنکھوں کے سامنے
 ناچنے لگے چٹھی بند کر کے وہ کسی طرح اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گئی۔ اتنی
 بڑی خوشخبری بھی اُس کے دل میں کوئی مسرت پیدا نہ کر سکی۔



چھاباب^ط

تقریباً ایک ماہ ہوا کہ گنج ناتھ کی شادی ہو گئی ہے۔ اُس دن کے بعد بند راہن پھر نہیں آیا۔ شادی کے دن بھی وہ یہ کہہ کر غیر حاضر رہا کہ مجھے بنجارہ ہو گیا ہے۔ اُس کی ماں چرن کو لے کر صرف اُسی دن کے لئے آئی تھیں۔ کیونکہ اپنے گھر کے دیوتا کو چھوڑ کر وہ کہیں دوسری جگہ رہ نہیں سکتیں۔ صرف چرن چار پانچ دن رہا۔ اپنے دل کے مطابق ماں پا کر اور کچھ ندی میں نہانے کے لالچ سے، اُس نے لوٹ کر اپنے گھر جانا نہیں چاہا۔ لیکن چند دن کے بعد وہ اسے ربروستی گھر لے گئے۔ اُس وقت سے گتسم کا جینا دو بھر ہو گیا ہے۔

شادی سے پہلے گتسم کے دل میں جو شبہات پیدا ہوئے تھے۔ اب وہ حرف بحرف پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے بھائی کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بھیا اپنی ساس کے کہنے پر گھر کی یہ تکلیف دہ زندگی چھوڑ کر اپنے سسرال جانے کے لئے تیار

ہو جائیں گے۔ ٹھیک وہی ہوا۔ جس سر پر سہرا باندھ کر گنج شادی کرنے گیا تھا، اب اُس پر ٹوکرا اٹھانا اس نے پسند نہیں کیا۔ اگر نل ڈانکے کے لوگ نہیں گئے تو کیا کہیں گے۔ شادی کے وقت بندرا بن کی ماں نے بڑی دانشمندی کر کے کچھ نقد روپے دیئے تھے۔ انہی میں سے کچھ مال خرید کر باہر راستے پر چھپر ڈال کر وہ ایک میناری کی دکان کھول کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہاں ایک پیسے کی بھی بکری نہیں ہوتی۔ اس ایک ماہ کے دوران میں وہ نئے کپڑے اور نئے جوتے پہن کر تین بار مسرال جا چکا تھا۔ پہلے وہ کسٹم سے بہت ڈرا کرتا تھا۔ لیکن اب نہیں ڈرتا۔ جب اُسے کہا جاتا کہ گھر میں چاول وال کچھ بھی نہیں ہے۔ تو وہ چُپ چاپ جا کر دکان پر بیٹھ جاتا یا کہیں ادھر ادھر کھسک جاتا اور دن بھر گھر نہ آتا۔ یہ حال دیکھ کر کسٹم بہت گھبرائی۔ اُس کے پاس جو تھوڑے سے جمع کئے ہوئے روپے تھے، وہ سب خرچ ہو کر ختم ہونے کو تھے۔ مگر گنج نے آنکھیں نہ کھولیں اپنی نئی دکان پر بیٹھ کر سارا دن وہ تمباکو پینے اور اُونگھنے میں ضائع کر دیتا۔ جب دوپارا آدمی آ بیٹھتے تو وہ اپنے مسرال کی باتیں سنانے اور اپنی نئی جائیداد کی فہرست تیار کرنے میں مصروف ہو جاتا۔

اُس دن گنج صبح اُٹھ کر اپنے نئے چمکیلے جوتوں میں تیل لگا کر انہیں اور چمکارا ہوا تھا۔ کسٹم رسوئی گھر سے باہر نکل کر تھوڑی دیر تو دیکھتی رہی پھر بولی ————— ”معلوم ہوتا ہے آج پھر نل ڈانکے جاؤ گے؟“

کنج صرف ”ہوں“ کر کے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
 کچھ دیر بعد کسٹم نے نرم آوازیں کہا — ”بھتیہ! ابھی تم اُس
 دن تو وہاں گئے تھے۔ آج ذرا جا کر میرے چرن کو دیکھ آؤ! بہت دن
 سے لڑکے کی کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔“
 کنج نے چڑ کر کہا — ”نہارا دل تو سبھی باتوں میں گھبراتا ہے۔
 وہ اچھی طرح ہے۔“

کسٹم کو غصہ آ گیا — لیکن اُسے روک کر بولی — ”وہ اچھا
 ہی رہے۔ پھر بھی، جا کر اُسے ایک مرتبہ دیکھ آؤ، سُسرال کل
 چلے جانا۔“

کنج نے گرم ہو کر کہا — ”کل جانے سے کیسے کام چلے گا؟ وہاں
 کوئی مرد تو ہے نہیں۔ زمین جائیداد اور گھربار کی نگرانی کا سارا بوجھ
 میرے ہی سر تو ہے۔ میں اکیلا آدمی کدھر کدھر دھیان دوں؟
 بھائی کی بات چیت اور رنگ ڈھنگ سے اب کی بار کسٹم
 ناراض ہونے پر بھی ہنس پڑی۔ اُس نے ہنستے ہنستے کہا —
 ”نہیں بھتیہ تم سب سنبھال لو گے۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں، آج
 ایک بار چلے جاؤ۔ سچ مچ نہ جانے آج کیوں میرا دل اس کے لئے
 بہت گھبرا رہا ہے۔“

کنج جوتوں کو ہاتھوں سے ہٹا کر بڑی کرخت آوازیں بولا —
 ”مجھ سے نہیں جایا جائیگا۔ بند رابن میری شادی کے وقت نہیں

آئے، کیوں، وہ کیا اتنے ہی بڑے آدمی ہیں، جو ہمارے یہاں آ نہیں سکے؟“

اگرچہ گنج کی باتیں کسٹم کے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھیں، پھر بھی اُس نے سنجیدگی سے کہا — ”اُس دن انہیں بخار آ گیا تھا،“ ”بخار و خار نہیں آیا تھا — نل ڈانگے میں میری سانس نے اس خبر کو سُن کر اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ جھوٹ ہے، چالاکی ہے۔ انہیں دھوکا دینا کوئی آسان بات نہیں۔ جانتی ہو، وہ گھڑ بیٹھی دُنیا بھر کی خبر بتلا سکتی ہیں۔ نمک حرام اور کسے کہتے ہیں؟ ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔ میں اُن کا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا، اتنا کہ گنج کھڑا ہو کر پُر وقار انداز میں جوتا پہننے لگا۔“

کسٹم تھوڑی دیر تک اس طرح خاموش کھڑی رہی جیسے اُس پر پہاڑ گر پڑا ہو۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا: ”وہ نمک حرام ہیں تم نے اُس دن اُن کو خوب ہی تو نمک کھلایا تھا جس دن اپنے گھر بلا کر خود بھاگ گئے تھے۔ بھتیجا! میں خواب میں بھی یہ خیال نہ کر سکتی تھی کہ تم ایسے احسان فراموش ہو جاؤ گے۔“

اس الزام کا گنج کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے وہ اس طرح کھڑا رہا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

کسٹم نے پھر کہا — ”جسے تم زمین جائدا کہتے ہو وہ تمہاری کس طرح ہوئی؟ آخر تمہاری شادی کس نے کرائی تھی؟“

گنج نے بگڑ کر جواب دیا — ”کون کسی کی شادی کرتا ہے؟ ماں
(ساس) کہتی ہیں کہ جب پھول کھلنا چاہتا ہے، تو اُسے کوئی روک نہیں
سکتا۔ بیباہ اپنے آپ ہو جاتا ہے۔“
”اپنے آپ ہو جاتا ہے؟“
”ہوتا ہی تو ہے۔“

کسم نے اور کچھ نہیں کہا — چپ چاپ اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔
شرم اور نفرت کے مارے اُس کی چھاتی پھٹنے لگی۔ چھی، چھی اگر کہیں وہ
یہ باتیں سن پائیں، اُنیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ دونوں بہن بھائی ایک ہی
ساچے میں ڈھلے ہیں قریباً بیس منٹ بعد جب کسم نے نئے جوتوں کے
پہنے جانے کی آواز سنی تو اُس نے باہر آ کر پوچھا — ”کب کوٹو گے؟“
”کل صبح۔“

”مجھے اس طرح گھر پر اکیلے چھوڑ کر جانے میں تمہیں ڈر نہیں لگتا، شرم
نہیں آتی؟“

”کیوں، کیا یہاں کوئی شیر یا بھیر یا بیٹھا ہے جو تمہیں کھا جائیگا؟
میں صبح ہی تو لوٹ آؤں گا۔“ یہ کہہ کر گنج سسرال کو چل دیا،
کسم نے لوٹ کر جلتے ہوئے چوڑھے میں پانی ڈال دیا اور جا کر
بستر پر لیٹ گئی۔

ساتواں باب

جس طرح کوئی بُرے کام کرنے والا مایوسی اور نا اُمیدی کے عالم میں اپنا قصور تسلیم کرنے لگتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح کی شکل بنا کر بند رابن نے اپنی ماں کے پاس جا کر کہا۔ ”ماں تم مجھے معاف کرو اور اجازت دو کہ میں ڈھونڈ کر تمہارے لئے ایک داسی لے آؤں مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تم گھر گریستی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے ہی مر جاؤ“

ماں ٹھا کر گھر میں پُوجا کا سامان ٹھیک کر رہی تھی۔ مسر اُٹھا کر بولی ”کیا کریگا؟“

”تمہارے لئے ایک داسی لے آؤں، وہ چہرہ کو دیکھے گی، تنہا ہی خدمت کرے گی، اور ضرورت ہونے پر ٹھا کر جی کی سیوا اور پُوجا کا کام بھی کرے گی۔ بس، اجازت دیدو“ اتنا کہہ کر بند رابن بیچین اور دُکھی نگاہوں سے اپنی ماں کے منہ کی جانب دیکھنے لگا۔

اب ماں نے اپنے بیٹے کی بات کا مطلب سمجھا۔ کیونکہ اپنی قوم کے علاوہ اور داسی اس گھر میں آ نہیں سکتی تھی۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد اُس نے پوچھا — ”کیا تو یہ سچ کہہ رہا ہے؟“

”سچ نہیں، تو اور کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ تم جانتی ہو ماں، کہ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا؟“

”اچھا ذرا غور کر لوں“ کہہ کر بند راہن کی ماں کچھ ہنسی اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔

بند راہن سامنے جا بیٹھے اور بولے — ”نہیں ماں یہ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں دوں گا۔ یہی سوچ کر آیا ہوں کہ تم سے اجازت لے کر ہی اس کو ٹھڑی سے باہر نکلوں گا۔ اجازت لے کر ہی ٹلوں گا۔“

”سوچنے سمجھنے کے لئے وقت کیوں نہیں دو گے؟“

”ماں، اُس کی ایک وجہ ہے۔ تم سوچ سمجھ کر جو کچھ کہو گی، وہ تمہاری اپنی بات ہوگی، میری ماں کا حکم نہیں ہوگا۔ میں بھلا برا مشورہ نہیں چاہتا، صرف اجازت چاہتا ہوں۔“

ماں نے سر اٹھا کر اور کچھ دیر ادھر ادھر دیکھ کر کہا: ”لیکن، جب ایک دن حکم دیا تھا، تجھے منانا چاہا تھا، تو تو مانا نہیں تھا بند راہن!“

”یہ نہیں جانتا ہوں ماں۔ اُسی گناہ کی پاداش میں تو اس وقت چاروں طرف سے مشکلات میں گھر گیا ہوں۔“ یہ کہہ کر بند راہن نے

سر جھکا لیا۔

”لڑکے نے یہ تجویز صرف میری راحت کے لئے ہی پیش کی ہے۔ اور اسے عملی شکل دیتے ہوئے نہ معلوم ان کے دل پر کیا گزرے گی یہ سوچ کر ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے بیٹے کو ٹالنے کی غرض سے کہا: ابھی رہتے دو، بند راہن۔ دو ایک دن بعد کہوں گی؟“

بند راہن نے خد کرتے ہوئے کہا: ”جس وجہ سے تم پس و پیش کر رہی ہو ماں، وہ بات دو دن بعد بھی نہ ہوگی۔ جس نے تمہارا ایمان کیا ہے۔ اگر خواہش ہو تو تم اسے معاف کر سکتی ہو۔ لیکن میں نہیں کروں گا۔ ماں، اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے اجازت دید و تا کی نہیں سکھی ہو کر زندگی گزاروں؟“

ماں نے تھوڑی دیر سوچ کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا: —
”اچھا جاؤ، اجازت دیتی ہوں۔“

بند راہن نے اس سرد آہ کا مطلب سمجھ لیا۔ لیکن انہوں نے پھر کوئی بات نہیں کہی۔ چپ چاپ چہ زبوں کی خاک پیشانی پر لگا کر وہ کوٹھڑی سے باہر نکل آئے۔

اتنے میں پانٹھ سالہ کے ایک لڑکے نے آکر اُن کے ہاتھ میں ایک چٹھی دے کر کہا: ”پنڈت جی یہ آپ کی چٹھی ہے۔“

ماں نے اندر سے پُچھا: ”بند راہن! کس کی چٹھی ہے؟“
”معلوم نہیں۔ دیکھتا ہوں ماں۔“

یہ کہہ کر بند را بن حیران ہو کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کھول کر دیکھا، کسی عورت کے ہاتھ کی صاف اور خوبصورت تحریر تھی۔ نہ کہیں کانٹ چھانٹ تھی نہ جملوں کی کوئی غلطی۔ اوپر شرمی چہرہ نکلیش؛ لکھا ہوا تھا۔ لیکن نیچے دستخط نہیں تھے۔ پہلے کبھی کسٹم کی تحریر دیکھی نہ تھی۔ پھر بھی فوراً سمجھ لیا کہ یہ اُسی کی چٹھی ہے۔

اُس نے لکھا ہے — ”میرے بھائی کو دیکھو گے تو شائد اب تم پہچان بھی نہ سکو گے۔ کیوں؟ یہ کسی دوسرے سے نہیں کہا جاسکتا۔ یہاں تک کہ تم سے کہتے ہوئے بھی شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ آج وہ پھر سسرال گئے ہیں۔ شائد کل واپس آئینگے۔ ممکن ہے کل بھی نہ آئیں۔ کیونکہ وہ کہہ گئے ہیں کہ یہاں شیر یا بھڑیے نہیں بیٹھے جو مجھے اکیلی پا کر کھا جائیں گے۔ تم میں اگر اتنا حوصلہ نہ ہو، تو میرے چہرے کو ضرور دے جانا۔“

صبح بھائی اُسے ناراض ہو کر کسٹم نے جلتے ہوئے پٹوے میں پانی ڈال دیا تھا۔ اس نے اُسے نہیں جلایا۔ سارا دن بھوکے پیڑی رہی۔ اُمید ویم کے عالم میں وہ ہزار بار اندر باہر پھری۔ لیکن اب جب شام ہو گئی اور کسی کے آنے کی امید نہ رہی تو اس خیال سے اس کا خون منجمد ہونے لگا کہ اس منسان مکان میں اسے تنہا ساری رات کاٹنی پڑے گی۔ اُسی وقت اُس نے سنا کہ باہر چہرے زور زور سے ”ماں ماں“ پکار رہا ہے۔ اُس وقت اُس کا تفکرات کے سمندر میں ڈوبا ہوا دل جیسے زمین پر پاؤں

رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دوڑی ہوئی باہر نکلی اور چرن کو گود میں لے کر اُس کے منہ پر اپنا منہ رکھ کر اس خیال سے تسکین حاصل کرنے لگی کہ اب میں اکیلی نہیں ہوں۔“

چرن نوکر کو ساتھ لایا تھا۔ رات کو کھانا وغیرہ کھانے کے بعد کُنج کی دکان میں اُس کا انتظام کروایا گیا بستر پر لیٹ کر، چرن کو چھاتی کے نزدیک کھینچ کر کُسم نے کئی طرح کے سوال کئے۔ آخر میں اُس نے پوچھا: ”ہاں رے چرن، تیرے بابو جی کیا کرتے ہیں؟“

چرن جھٹ پٹ اٹھا اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک چھوٹی سی پوٹلی نکال لایا۔ اُسے کُسم کے ہاتھ میں دے کر بولا: ”ماں، میں بھول گیا تھا۔ بابو جی نے یہ تمہیں دینے کے لئے دی ہے۔“

”کُسم نے اُس پوٹلی کو ہاتھ میں لیتے ہی سمجھ لیا کہ اس میں پٹے ہیں۔“ چرن نے کہا: ”بس، اسے دے کر ہی بابو جی چلے گئے۔“

کُسم نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”وہ کہاں سے لوٹے تھے؟“

چرن نے ہاتھ اٹھا کر بتایا: ”وہاں سے، اُس جگہ سے۔“

”ندی کے اس پار تک آئے تھے؟“

چرن نے سر ہلا کر کہا: ”ہاں، آئے تو تھے۔“

کُسم نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خود داری کے مارے خاموش ہو کر بڑی سی۔ اُس دن جب وہ بغیر ایک گھونٹ پانی پئے چرن کو

لے کر چلے گئے تھے اور اُس نے بھی غصے کے مارے دوبارہ نہیں روکا۔

بلکہ اُدھر سے کچھ کڑی باتیں کہہ دیں تھیں۔ اُس دن سے پھر اُن کی شکل نہیں دکھائی دی تھی۔ پہلے اس طرف آنے جانے کے اُن کے سینکڑوں کام رہا کرتے تھے۔ لیکن اب ادھر آنے کا کوئی مقصد ہی نہیں رہا۔ لیکن خیر اُن کا مقصد نہ رہا ہو، سب کچھ جاننے والے پر ماتما تو جانتے ہیں کہ وہ کس طرح ایک ایک کر کے اپنے دن کاٹتی ہے۔ اور صبح سے راستہ دیکھتے دیکھتے شام کر دیتی ہے۔ راستے میں کسی آئی جاتی ہیں گاڑی کی آواز سننے ہی اس کی رگوں میں خون کس طرح تیزی سے دوڑنے لگتا ہے اور کتنی اُمیدوں کے ساتھ دوڑ کر کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر وہ کسی کی راہ دیکھنے لگتی ہے۔ وہ بھیتا کی شادی کی رات بھی نہیں آئے اور آج بھی دروازے کے باہر سے ہی چُپ چاپ لوٹ گئے۔ — پھر اسے اس دن کی بات یاد آئی جس دن گُنج گڑوں کی جوڑی لوٹا نے گیا تھا اور اُن کے مُنہ سے سُن آیا تھا کہ بھگوان نے ان کی چیز انہی کو لوٹا کر انہیں ایک سبق دیا ہے :

وہ سوچنے لگی کہ اگر سچ مچ ہی ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہو تو کیا ہو گا؟ اس نے اپنی طرف سے تو چوٹ پہنچانے کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بار بار ان کا اپمان کیا اور ماں کا اپمان کرنے سے بھی باز نہیں رہی۔ بہت سوچ بچار کے بعد بھی یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس دن اس کی عقل اس طرح کیوں جاتی رہی تھی۔ اس کا تمام معنوی وجود اس کے اُس غصے پر ملامت کر رہا تھا جس کے زیر اثر اُس روز

وہ اُس مقدس رستے کو توڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی جسے وہ ایک مدت سے دل و جان کے ساتھ تسلیم کرتی رہی تھی۔ وہ اپنے دل کے ساتھ مباحثہ کرنے لگی۔ کیوں، یہ کیا میرے اپنے ہاتھ سے باندھا ہوا سبب ہے جو میرے نہیں، نہیں، کرنے سے ٹوٹ جائیگا۔ اور اگر یہ ٹوٹ سکتا ہے یا وہ حقیقت میرے سوامی نہیں ہیں تو پھر وہ میرے دل کی ساری بھگتی اور پریم کے مالک کیوں بن گئے۔ صرف ایک ہی دن کی بات چیت اور معمولی سی خدمت کے عوض ان کے لئے دل میں اتنا پریم کیوں پیدا ہو گیا۔ وہ بار بار زور دے کر کہنے لگی "نہیں، میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ یہ سب جھوٹ سے میری بدنامی کی بات کبھی سچتی نہیں ہو سکتی۔ ماں صرف اپنے اہمان کا انتقام لینے کے لئے یہ نہ مٹنے والا کلنک میرے سر پر مڑ گئی ہیں۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر دل ہی دل میں باتیں کرنے لگی۔ "ماں مر گئی ہیں۔ سچ جھوٹ کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ لیکن میں چاہے کچھ نہ کر سکوں۔ وہ خود بھی تو جانتے ہیں کہ میں ان کی دھرم پٹنی ہوں۔ تو پھر وہ میری یہ نامناسب ضد کیوں برداشت کرتے ہیں۔ وہ زور کر کے کیوں نہیں آتے اور میرے غرور کو پاؤں تلے روند کر زبردستی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے۔ آخر میں ماں، یا "نہیں" کرنے والی کون ہوں اور ان کو میری نہیں تسلیم کرنے کا کیا حق ہے۔" اچانک اس کا سارا جسم کانپ اٹھا جس سے سوئے ہوئے

چرن کی نیندا چاٹ ہو گئی۔ اس نے کہا کیا ہے ماں؟
 کسم نے اسے کلجے سے لگا کر آہستہ سے کہا ”چرن پٹا تو بتا زیادہ
 پیار کس سے کرتا ہے۔ مجھے سے یا بابو جی سے؟“
 چرن نے فوراً جواب دیا ”تم سے“
 ”بٹا ہو کر اپنی ماں کو کھانے کو دیگا چرن؟“
 ”ہاں دُونگا“

”جب میرے بابو جی مجھ کو نکال دینگے تو تو آسرا دیگا؟“
 ”ہاں دُونگا“

چرن یہ تو نہیں سمجھتا تھا کہ ماں کو کس حالت میں کیا دینا ہوگا لیکن
 اتنا وہ ضرور جانتا تھا کہ اپنی نئی ماں کے لئے اسے سب کچھ ہی کرنا
 چاہئے۔

کسم کی آنکھوں میں آنسو آئے جب چرن سو گیا تو اس نے آنسو
 پونچھ لئے اور چرن کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگی ”مجھے ڈر
 کس بات کا ہے۔ میں لڑکے کی ماں ہوں اگر اور کوئی نہیں تو وہ تو مجھے
 سہارا دیگا ہی“

دوسرے دن سورج طلوع ہونے کے تھوڑی دیر بعد جب ماں
 پٹا نہا کر ندی سے گھر لٹے تو ایک ادھیر عمر کی عورت کو والاں
 میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ کُنج ناتھ سے مختلف قسم کے سوال دریافت
 کو رہی تھی اور کُنج ناتھ بڑی ہی جلیبی سے سوالات کے مناسب جواب

دے رہا تھا۔

وہ کنج ناتھ کی ساس تھی۔ وہ صرف اشتیاقاً اپنے داماد کا گھر بار دیکھنے نہیں آئی تھی بلکہ اس گھر کو دیکھ کر اس بات کا فیصلہ کرنے آئی تھی کہ اپنی اکلوتی لڑکی کو کسی دن یہاں بھیجنا ٹھیک ہو گا یا نہیں۔ اچانک کُسم کو آتے دیکھ کر وہ حیران ہو کر اُس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔

— شباب پانی سے بھیستے ہوئے کپڑوں میں سماتا نہیں تھا۔ جسم کا خوبصورت رنگ بھیگی دھوئی میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا۔ اُس کے گیلے بال پشت پر سے ہوتے کُٹھنوں کو چھوتے ہوئے اس طرح ارارہے تھے جیسے ہزاروں سیاہ ناگنیں اکٹھی ہو کر رین۔ بر ناچ رہی ہوں۔ بائیں طرف اُس کی کمر پر ایک بھرا ہوا گھڑا تھا اور داہنے ہاتھ سے وہ چرن کا بایاں ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ چرن کے ہاتھ میں بھی پانی سے بھرا ہوا ایک چھوٹا سا لوٹا تھا۔ مُونیا میں ایسی منوہر مورتی شاید ہی کبھی دکھائی پڑتی ہے۔ اور جب پڑتی ہے تو حیران ہو کر دیکھتے رہ جانا ہی پڑتا ہے۔ کنج ناتھ بھی مکملی لگا کر اُس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر کُسم کو بہت شرم آئی۔ وہ جلدی سے وہاں سے جانے لگی لیکن کُنچ کی ساس بول اُٹھی: ”یہی کُسم ہے شاید؟“

کُنچ نے خوش ہو کر کہا: ”ہاں ماں، یہ میری بہن ہے۔“

سارا انگن گوہر سے پوتا ہوا تھا۔ اس لئے کُسم نے پانی کا گھڑا وہیں رکھ کر اُسے پر نام کیا۔ ”ماں کی دیکھا دیکھی چرن نے بھی پر نام کیا۔“

وہ بولی ”مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اس لڑکے کو کہیں دیکھا ہے۔“
لڑکے نے فوراً جواب دیا ”میں چرن ہوں۔ میں دادی جی کے ساتھ
تمہارے گھر ماموں جی کی ہود دیکھنے گیا تھا۔“

کُسم نے ہنستے ہوئے بڑی محبت سے چرن کو اپنے پاس کھینچ کر لیا، اور
کہا ”نہیں بیٹا ایسا نہیں کہنا ہوتا۔ ایسے کہا جاتا ہے کہ میں مانی جی
کو دیکھے گیا تھا۔“

کُنج کی ساس نے کہا ”شاید بندہ راویشنو کا لڑکھٹے ہے؟ اس
ہاتھ بھر کے لڑکے کی باتیں تو سنو۔“

کُسم کا خوبصورت چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اُس نے ایک بار اپنے بھائی کے
مُٹہ کی طرف دیکھا، اور ایک بار اُس بالکل جاہل بد زبان عورت کے مُٹہ
کی جانب، پھر وہ گھڑا اٹھا کر اور لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر رسوئی گھر میں چلی گئی۔
اچانک یہ کیا ہو گیا!

کُنج بے سمجھ ہے، لیکن ساس کا رویہ اسے بھی ناگوار لگا خصوصاً اس
کہ وہ اپنی بہن کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس کا چہرہ دیکھ کر
اُس نے اندازہ کر لیا کہ اس وقت اُس کے دل کے جذبات کیا ہیں۔
وہ دل ہی دل میں بے چین ہوا اٹھا۔ اس کی ساس بھی دل ہی دل میں
شر مساء ہوئی۔ اس قسم کی گفتگو کرنا مقصد اس کا بھی نہیں تھا صرف عادت
سے مجبور ہو کر یہ الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے تھے۔

رسوئی گھر میں سے کُسم نے گول کی بیوہ کی جانب اچھی طرح دیکھا۔

”مُحرا بھی پورے چالیس برس کی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی دھوتی تو سادہ تھی لیکن نگلے میں سونے کا ہار، کانوں میں بالیاں اور بازوؤں میں بازو بند تھے۔ اپنی ساس سے مقابلہ کرنے پر اُسے اس کے ساتھ نفرت ہو گئی + وہ کُنچ سے باتیں کر رہی تھی کہ کیا باتیں تھیں، اُن کو نہ سن سکنے پر بھی اُس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ باتیں اسی کے متعلق ہو رہی ہیں +

کُنچ کی ساس پان اور چھالیہ کا کچھ زیادہ استعمال کرتی ہے۔ اور یہ کام صبح سے شروع ہو کر تمام دن جاری رہتا ہے۔ اشنان کے بعد اُس نے اپنے بدن پر چندن کی اچھی طرح مینا کاری کی رویشنوؤں میں سارے جسم پر چندن تک کی مینا کاری کرنے کا رواج ہے پان اور آرائش وغیرہ کا تمام سامان وہ اپنے ساتھ ہی لیتی آتی تھی۔ یہاں تک کہ مُنہ دیکھنے کے لئے آئینہ تک نہیں بھولی تھی۔ کُسم پو جا پاٹھ وغیرہ سے فارغ ہو کر رسوئی کرنے بیٹھی تھی کہ وہ اس کے پاس آ بیٹھی اور ادھر ادھر دیکھ کر کچھ ہنس کر بولی ”کیوں جی، نہ تو تمہارے نگلے میں مالا ہے اور نہ تم نے تلمک ہی لگایا ہے۔ تم کیسی ویشنو کی لڑکی ہو بیٹی؟“

کُسم نے مختصر سا جواب دیا — ”یہ سب میں نہیں کرتی؟“
”نہیں کہنے سے کیسے کام چلے گا؟ اس حالت میں تو تمہارے ہاتھ کا کوئی پانی بھی نہ پئے گا۔“

کُسم نے مُڑ کر پوچھا ”تو پھر میں آپ کے لئے رسوئی کا الگ انتظام کر دوں؟“

”میں تو گھر کی ٹھیری، تمہارے ہاتھ کا کھا ہی لوں گی۔ لیکن دوسرا کوئی تو نہ کھائیگا؟“

”کُسم نے کوئی جواب نہیں دیا۔
اتنے میں کُنج نے آکر پوچھا۔ ”کُسم! چرن کب آیا؟“
”کل شام کو“۔

”کُنج کی ساس نے کُنج کو مخاطب کر کے کہا۔ ”ابھی ابھی سُنا ہے کہ بند رابن اسے نہیں بسائیگا، لیکن لڑکے کو تو نوکر کے ساتھ بھیج دیا ہے،“ کُنج نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ بات تم نے کہاں سُنی ماں؟“
”ساس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میرے اور بھی چارکان ہیں اور چار آنکھیں ہیں بیٹا، جو کچھ سُنا ہے بالکل ٹھیک سُنا ہے۔ اُن لوگوں نے اتنا کہا سُنا، سمجھایا، دوڑ دھوپ کی پھر بھی تمہاری بہن راضی نہ ہوئی، لوگ تو طرح طرح کی باتیں کریں گے ہی۔“
”مجھے میں کئی جوان لڑکے ہیں۔ تمہاری بہن کی چڑھتی جوانی ہے، نکھر رہا سونے کا سارنگ ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ میں اور موتی ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ پیرے بھلنے اور من ڈمگانے میں کتنی دیر لگتی ہے بیٹا؟“

”کُنج نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ٹھیک کہتی ہو ماں؟“
”کُسم نے اچانک سر اٹھا کر اور آنکھیں چڑھا کر کہا۔ ”بھیا تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ اُٹھ جاؤ یہاں سے۔“

”کُنج تو سہم کر وہاں سے اُٹھنے لگا لیکن اُس کی ساس نے گرم ہو کر

کہا۔ ”بھتیجا سے پُچھنے سے تو اور لوگوں کی آنکھوں پر پردہ نہیں پڑ جائیگا بیٹی۔ ابھی تم ندی سے نہا کر، سر کے بال کھولنے، بھیلگی دھوتی سے گھرائی ہو، اب تمہارے بھائی ہی چھاتی پر ماتھ رکھ کر کہیں کہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر رشیوں کا دل بھی ڈول جاتا ہے یا نہیں؟“
کسٹم نے چلا کر کہا۔ ”تمہارے پاؤں پڑتی ہوں بھتیجا۔ کھڑے کیا سُنتے ہو۔۔۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے!“

اُس کا یہ چلانا اور چہرے کا رنگ دیکھ کر کنج گھبرا کر بھاگا۔ کسٹم چوٹھے پر سے ترکاری کی کڑاہی دھم سے نیچے پٹاک کر جلدی سے رسوئی گھر سے باہر ہو گئی۔

کنج کی ساس کا منہ سیاہ پڑ گیا، وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اُس کا خیال تھا کہ مجھ سے بڑھ کر بد زبان اور لڑاکی دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ اُس نے خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ بے سہارا اور غریب لڑکی اُسے اس طرح مات دے سکتی ہے۔



اٹھواں باب

یہ تو قسم نہ سمجھ سکی کہ کیوں؟ لیکن اس میں اُسے ذرا بھی شک نہ رہا کہ اُس دن بھائی کی ساس لڑائی جھگڑے کا عزم ہی کر کے آئی تھی اُس کے کہنے کا صاف مطلب یہی تھا کہ بندہ رابن کے منظرہ کرنے اور لے جانے کی خواہش کے باوجود کسٹم کسی خاص اور خفیہ راز کی وجہ سے وہاں نہیں گئی۔ اوروہ پوشیدہ راز کیا ہے یہ وہ خود تو جانتی ہی تھی، خود بندہ رابن نے بھی اس وجہ سے اس کو اپنے گھر لے جانے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ اس اشارے نے کسٹم کو آپے سے باہر کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ میرا سوئی ٹکڑ سے اس طرح اٹھ کر چلا آنا مناسب نہیں ہوا۔

کنج کی ساس نے تمام دن کچھ نہیں کھایا۔ اور بہت منت سماجت کے بعد کہیں رات کو کھانا کھانے پر راضی ہوئی، اُس کی عزت رکھنے کے لئے کنج دن بھر اپنی بہن کو برا بھلا کہتا رہا۔ لیکن غصہ ختم ہو جانے پر

بھی اُس نے کُسم کو کھانا کھانے کے لئے کہنا ضروری نہ سمجھا۔ دوسرے دن صبح جب کُنج کی ساس اپنے گھر جانے لگی تو کُسم نے اُس کے ہاتھ چھوئے اور اُس کے پاؤں کی خاک پیشانی پر لگا کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ لیکن کُنج کی ساس اُس سے نہیں بولی، بلکہ اپنے دادا کو اشارہ کر کے کہا ”تمہیں اپنے گھر بار اور زمین جائیداد کی دیکھ بھال بھی کرنی چاہیئے۔ یہاں بہن کے پاس بیٹھے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا“۔

کُسم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے وہ چپ چاپ سر جھکا کر سنتی رہی۔ ٹھیک ہی تو ہے! بھلا بھائی یہاں وہاں دونوں جگہ کا کام کیسے سنبھالے گا؟

اس بات کو قریباً دو ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں کُنج کی ساس نے اُسے گویا بالکل ہی توڑ پھوڑ کر از سر نو گھوڑا لایا تھا۔ اب وہ عموماً یہاں نہ رہتا اور جب رہتا بھی، تو اچھی طرح بات نہ کرتا۔ کُسم سوچتی کہ ایسا آدمی ایک دم کیونکر بدل گیا اگر وہ یہ جانتی کہ دنیا میں اکثر یہی ہوتا ہے۔ کُنج ایسے سادہ دل اور کم عقل لوگوں کی طبیعت میں ہی اچانک انقلاب آیا کرتے ہیں شاید اسے اس قدر دکھ نہ ہوتا۔ لیکن وہ دنیا کے طور پر قبول سے ناواقف تھی۔ بھائی بہن میں وہ پہلی سی محبت اب کہاں تھی۔ اب تو لڑائی جھگڑا بھی نہ ہوتا تھا۔ اس کی تو کُسم کو نہ خواہش ہی ہوتی تھی اور نہ حوصلہ ہی پڑتا تھا۔ اُس دن گھر میں صرف ایک رات تنہا رہنے پر ہی وہ بے چین ہو گئی تھی۔ لیکن اب نہ معلوم کتنی راتیں تنہا گزر جاتی

تھیں۔ مصیبت میں پڑنے کی وجہ سے اُس کا ڈر اور خوف بھی جاتا رہا تھا۔
 ان سب مصائب کی بھی وہ پروا نہ کرتی تھی۔ لیکن یہ بات اُس کے
 دل میں ہر وقت اٹھتے بیٹھتے کانٹے کی مانند کھٹکتی رہتی کہ میں بھائی کے
 گلے کا پھندا بن گئی ہوں۔ وہ رہ رہ کر سوچتی کہ اگر اب میں اچانک مر
 بھی جاؤں تو شاید بھائی کی آنکھ سے ایک بوند آنسو نہ نکلے۔ کُنج کی ان
 ظالمانہ لغزشوں اور کمزوریوں سے بد دل ہو کر بارہا وہ گھر کے کواڑ بند
 کیسے کیٹھ جاتی اور پہروں آنسو بہاتی رہتی۔ جب اس کا دل بہت ہی
 اُداس ہو جاتا، تو وہ چمن کی باتیں سوچنے لگتی۔ صرف وہی ہر بار
 ماں ماں کرتا ہوا ڈوڑا آتا تھا اور کسی طرح بھی اُسے چھوڑنا پسند نہ
 کرتا تھا۔

اُسی کے ہاتھ ایک دن شرم و حجاب اور پس و پیش کو پرے
 پھینک کر اس نے بند رابن کو ایک چٹھی بھیجی تھی۔ اُس چٹھی میں جو اشارہ
 پنہاں تھا، بند رابن کے لئے وہ بالکل بے اثر ثابت ہوا۔ اور جس جواب
 کی کُسم منتظر تھی، وہ تو کیا آتا، سفید کاغذ پر لکھی ہوئی دو سطریں بھی
 موصول نہ ہوئیں۔ صرف کچھ روپے تھے جو چار و ناچار کُسم کو لینے
 ہی پڑے۔

کل رات کو کُنج گھر آیا تھا۔ آج صبح ہی واپس لوٹ جانے کے
 لئے تیار ہو کر جب وہ باہر نکلا تو کُسم اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی
 ان دونوں نہ تو وہ کسی چیز کے لئے بھائی سے تقاضا ہی کرتی تھی اور

نہ اسے کسی بات سے منع ہی کرتی تھی۔ آج نہ معلوم کیا بات تھی کہ اُس نے آہستہ سے کہہ دیا۔۔۔۔۔ بھیتا کیا اتنی جلد چلے جاؤ گے؟ کھانا تیار ہونے میں دیر نہیں لگے گی، دو گھنٹے کھا کر ہی جاؤ نا؟
کنج نے منہ پھیر کر اور شکل بگاڑ کر کہا: جو سوچا تھا وہی ہوا، مجھے چلتے وقت لوک دیا؟

مجبوری اور لاچاری نے کُسم کو بہت کچھ برداشت کرنا سکھادیا تھا۔ لیکن اس بے وجہ مُنہ بنانے سے اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جواب میں اُس نے اُسی طرح مُنہ تو نہ بگاڑا، لیکن بہت ہی سخت لہجے میں کہا: ”ڈرو نہ بھیا، تم مرو گے نہیں۔ آج تک میں نے تمہیں جتنی بار ٹوکا ہے اتنے میں، اگر تم آدمی ہوتے تو کبھی کے مر گئے ہوتے!“

”میں آدمی نہیں ہوں؟“

بتی نکتے بھی نہیں ہو۔ وہ بھی تمہاری نسبت اچھے ہوتے ہیں۔ ایسی نمک حرامی نہیں کرتے۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے کوٹھڑی میں چلی گئی اور بڑے زور سے کواڑ بند کر لئے۔ گنج کچھ دیر باگلوں کی مانند کھڑا رہ کر آہستہ آہستہ چلا گیا۔

باہر کا دروازہ ویسا ہی کھلا پڑا رہا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد اُسی کھلے دروازے سے بندر بن چپ چاپ اندر داخل ہوا اور وہاں کا نقشہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

کچ کی کوٹھڑی کا دروازہ بند، کُسم کی کوٹھڑی اندر سے بند اور

بادرچی خانہ کھلا پڑا ہوا۔ اُس کے اندر جھانکتے ہی ایک گتتا کوں کوں کر کے ندامت اور معذرت کا اظہار کرتا ہوا جلدی سے باہر نکل گیا۔ کھانا کچھ تو بہن چکا تھا اور کچھ باقی تھا۔ چوہا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ چرن نوکر کے ساتھ پیدل آ رہا تھا۔ اس لئے کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ زور زور سے ماں ماں پکارتا اور پاس پڑوس کے لوگوں کو اپنی آمد کی اطلاع دیتا ہوا اندر آ پہنچا۔ لڑکے کی اچانک آواز سن کر کسٹم دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور اس کی اشک آلود آنکھوں کی غمناک نگاہ سب سے پہلے بندر بن کی حیرت زدہ اور بے چین نگاہوں سے دوچار رہی۔

کسٹم کو نہ تو اس کی امید ہی تھی اور نہ خیال کہ وہ اچانک ہی جائیگے۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اُس نے آنچل سے منہ ڈھانپ لیا اور کوٹھڑی میں سے ایک آسن لاکڑ بچھا دیا۔ اتنے میں چرن دوڑتا ہوا آیا اور اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ کسٹم نے اُسے گود میں اٹھا کر اُس کا منہ جُم لیا اور وہاں سے ہٹ کر ایک ستون کی ادٹ میں کھڑی ہو گئی۔

ماں کے منہ کی طرف دیکھ کر چرن نے روندھی ہوئی آوازیں کہا

”بالو جی، ماں تو رو رہی ہے“

بندر بن یہ سمجھ گیا تھا، پوچھا ”کیا بات ہے؟ کس لئے بلا بھیجا تھا؟“

کسٹم ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی تھی۔ اس لئے کوئی جواب نہ

دے سکی؟

بندہ راہن نے پھر پوچھا۔ ”جتنی میں لکھا تھا کہ اگر بھیتا سے ملاقات کر لینا، وہ کہاں ہے؟“

کُسم نے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔ ”مر گیا!“

”ارے مر گئے؟ کیا ہوا تھا؟“

اُس کی سنجیدہ آوازیں طعنہ چھپا ہوا تھا۔ جو کُسم کے دل میں تیرکی مانند لگا۔ وہ اپنی موجودہ حالت کو بھول کر غصے سے جل اُٹھی اور بولی۔ ”دیکھو، مذاق نہ کرو۔ میرا جسم پہلے ہی جل جھن رہا ہے۔ اس وقت یہ رب اچھا نہیں لگتا۔ تمہیں بلا بھیجا تھا! کیا اسی لئے اُس کا بدلہ اس طرح ادا کرنے آئے ہو؟ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ اُس کا دہی آواز میں رونا بندہ راہن نے صاف سن لیا، لیکن پھر بھی وہ متاثر نہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پوچھا۔ ”مجھے کس لئے بلا بھیجا تھا؟“

کُسم نے آنسو پونچھتے ہوئے بھاری آواز سے کہا۔ ”جب تم آتے ہی نہیں تو میں کہوں کس سے؟ پہلے تو تم اپنے کام سے بھی ادھر آ جایا کرتے تھے۔ لیکن اب تو بھول کر بھی اس راہ میں پاؤں نہیں رکھتے؟“

بندہ راہن نے کہا۔ ”بھول نہیں سکتا، اس لئے پاؤں نہیں رکھتا۔ بھول سکتا تو شاید آتا۔“ خیران سب باتوں کو جانے دو،

کہو کیا بات ہے؟“

”اس طرح طعنے سن کر کوئی اپنے دل کی بات کس طرح کہہ سکتا ہے۔“

بند رابن ہندا اور سنجیدگی سے بولا: ”لٹھنے نہیں، سنجیدگی سے ہی پوچھتا ہوں۔ اچھا تو جس طرح کہنے میں آسانی ہو، تم اُسی طرح کہو۔“
 کُسم نے کہا: ”میں بہت دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ تم سے ایک بات پوچھوں گی۔ بھلا، یہ بات کس نے پھیلانی کہیں راستے میں بال بکھیرے اپنے حُسن کی نمائش کرتی پھرتی ہوں؟“

یہ سوال سُن کر بند رابن کچھ دیر مشدرا اور حیران رہ گیا اور پھر بولا: ”میں نے — اُس کے بعد؟“

”میں نے یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ بات پھیلانی تھی اور ایسا کبھی میرے دل میں خیال بھی نہیں آیا۔ لیکن —“

بند رابن کُسم کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا: ”لیکن اُس دن تو کہا بھی تھا اور سوچا بھی تھا۔ میں امیر ہو کر اُس دن تمہیں تنگ کرنے کے لئے ہی اپنی ماں اور بھائیوں کو لے کر تمہارے یہاں کھانا کھانے آیا تھا۔ اُس دن جو گناہ مجھ سے سرزد ہوا، اب کبھی نہیں ہوگا اور گناہ کی سزا میری ماں کو دینے سے تم بھی نہیں چوکیں۔“

کُسم نے بہت ہی دکھی اور شرمسار ہو کر آہستہ سے کہا: ”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی، میں بہت بڑے گناہ کی مُرتکب ہوئی۔ اُس وقت میں تمہیں پہچان نہ سکی تھی۔“

”اب پہچان لیا؟“

کُسم نے کوئی جواب نہ دیا۔ بند رابن کچھ دیر تک خاموش رہنے کے

بعد یکا یک بول اٹھا۔ ”اچھی بات ہے۔ ابھی ایک کُتا تمہارے
رسوئی گھر میں گھس کر سارے برتن اور کھانا خراب کر گیا ہے۔“
کُسم نے بھی غصے اور جوش کا اظہار نہ کر کے بڑی سنجیدگی سے جواب
دیا: ”کر جانے دو، میں تو کھاؤں گی نہیں۔ پہلے معلوم ہوتا تو کھانا بھی
نہ بناتی۔“

”شاید آج ایکادشی کا برت ہوگا“ (بنگال میں بیواؤں ہی ایکادشی کا
برت رکھتی ہیں)۔
کُسم نے سر جھکا کر جواب دیا: ”مجھے معلوم نہیں۔ یہ سب کچھ میں نہیں
کرتی۔“

”ایکادشی کا برت نہیں رکھتیں؟“
کُسم اُسی طرح سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔
بندر بن نے شک آمیز لہجہ میں کہا: ”پہلے تو کرتی تھیں۔ اب
یکا یکا کیوں چھوڑ دیا؟“
بار بار کی طعنہ زنی سے کُسم تڑپ اُٹھی۔ اُس نے کچھ ٹھنڈا ہو کر
اور جھنجھلا کر کہا: ”نہیں کرتی، میری مرضی۔ کوئی جان بوجھ کر اپنے
آپ کو برباد ہی کے مُنہ میں دھکیلنا نہیں چاہتا۔ اس لئے ایکادشی کا برت
نہیں رکھتی۔ جیسا کہ سلوک ناقابل برداشت ہے۔ لیکن سچ کہتی ہوں کہ ہمارے
سلوک سے تو دل چاہتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈال کر مر جاؤں۔“
”نہیں، اب ایسا نہ کرنا۔ میرے سلوک پر پھر کبھی غور کر لینا، اور

اگر نہ بھی کروگی، تو کوئی نقصان نہیں۔ لیکن کُنج کا سلوک کیوں ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے؟

کُسم نے غصے میں جواب دیا: بڑی لمبی داستان ہے، اُس کے سنانے کی ہمت مجھ میں نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اب وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر میری حفاظت نہیں کر سکتا۔ اُس کی ساس کا حکم نہیں۔ مجھے کھانے اور پہننے کا خرچ دینا بھی بند کر دیا ہے۔ اگر چرن اپنی ماں کی پرورش کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہ لے لیتا تو اب سے بہت دیر پہلے ہی میں بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گئی ہوتی۔ اس وقت میں — ”اتنا کہہ کر وہ رک گئی اور سوچنے لگی کہ اور کچھ کہنا مناسب ہے یا نہیں۔ پھر بولی: اب میری غور و پرداخت کا تمام بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے اس لئے یہاں ایک دن — ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتی۔“

بندر بان نے ہنستے ہوئے پوچھا — ”اسی لئے یہاں نہیں رہنا چاہتیں؟“

کُسم نے ایک بار آنکھیں اُپر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر نیچے جھکا لیا۔ اس اچانک سوال میں جو تیز طنز چھپا ہوا تھا اس سے اُس کے دل کو بڑی چوٹ لگی۔

”چرن اپنی ماں کی پرورش و پرداخت کا بوجھ ضرور اٹھائے گا۔ لیکن تم اب کہاں رہنا چاہتی ہو؟“

کُسم نے اُسی طرح سر جھکائے ہوئے جواب دیا — ”یہ

میں کیسے کہوں؟ وہی جانے؟

”وہ کون؟ — میں؟“

کسم چپ رہی لیکن اس کی خاموشی زبان حال سے کہہ رہی تھی۔

۱۰۰

بندہ راہن نے کہا۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تمہاری کسی بات

میں دخل نہیں دے سکتا۔ صرف ماں ہی دے سکتی ہے اُن کے ساتھ

تم نے خواہ کیسا ہی نامناسب اور ناروا سلوک کیا ہو۔ پھر بھی تم چمن کا

باتھ پکڑ کر ان کے پاس چلی جاؤ تو وہ ضرور انتظام کر دیں گی۔ لیکن

”تمہارا بھائی؟“

کسٹم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے انہیں بلو پچھتے

ہو۔ مے جواب دیا: میں کہہ تو چکی ہوں۔ کہ بھٹیا مر گیا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ

دن کے وقت پیدل چل کر بھکاریوں کی مانند تمہارے گاؤں میں

کس طرح جاؤں گی؟“

بند راہن نے جواب دیا: ”یہ تو یوں نہیں جانتا۔ لیکن اگر تم جاسکتیں

تو اچھا ہوتا۔ اس کے علاوہ اور کوئی صاف راستہ مجھے دکھائی

نہیں دیتا؟

گسٹم نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر جواب دیا ————— میں

نہیں جاؤں گی؟

”تمہاری مرضی“

بالکل مختصر اور صاف جواب تھا۔ اور اس میں کوئی ابہام یا رمز
 یہاں نہیں تھی۔ اب واقعی کسٹم ڈرگسٹی۔ تھوڑی دیر تک منہ اٹکھائے
 اس بات کا انتظار کرتی رہی کہ بندہ رابن اور کچھ کتنا ہے یا نہیں۔
 اس کے بعد اُس نے بڑی نرم اور روندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔۔۔
 ”لیکن اب یہاں بھی تو میرے سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔
 میں جیسا کہ بھی ملزم گردانا نہیں چاہتی، کیونکہ جو آدمی اپنا نقصان کرے،
 دوسروں کا بھلا نہ کر سکے، اُسے ملزم نہیں گردانا جاسکتا۔ لیکن تمہیں تو
 مجھے اس طرح دھتکار کر پھینکنا نہیں چاہیئے؟“

بند رابن کوئی جواب نہ دے کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا —
 ”اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ چمرن تو ماں کے پاس رہے گا یا میرے ساتھ
 چلے گا؟“

”رہیگا، اچھا، تو رہو۔۔۔ اور اگر تمہاری مرضی ہو تو آ جانا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم چرن کا ہاتھ پکڑ کر ماں کے سامنے جا کھڑی ہوؤ گی تو اس میں تمہاری کوئی زیادہ بے عزتی نہ ہوتی۔۔۔ خیر اب میں چلتا ہوں“ یہ کہہ کر بونہی بندرا بن نے قدم اٹھایا یکایک کتھم نے چرن کو گود سے اتار کر اور سیدھے کھڑے ہو کر کہا۔

—”آج میں سمجھ گئی۔ میں نے منہ پھاڑ کر اپنی پستکی کہانی سنائی
اس پر بھی جب تم نے کھڑے ہو کر کہا — دیر ہو رہی ہے، چلتا
ہوں، جب یہ معلوم ہو جانے پر بھی کہ میں کتنی بد قسمت اور مصیبت زدہ

ہوں۔ تم نے امداد کا ہاتھ نہیں بڑھایا، اور آسرا دینے سے بھی پس پٹش
کیا، تو اب نہ تو مجھے کچھ کہنا ہے اور نہ میری کوئی امید تم سے وابستہ
ہے۔ پھر بھی، ایک بات پوچھتی ہوں، بتاؤ ٹھیک ٹھیک جواب
دو گے؟

بند رہا میں نے حیرت سے سر اٹھا کر جواب دیا۔ ”دو بھکا
میں نے آسرا دینے سے پس و پیش نہیں کیا۔ بلکہ تم نے خود ہی
بار بار میری امداد لینے سے انکار کیا ہے۔“

کسٹم نے استقلال سے جواب دیا۔ ”بالکل جھوٹ۔ اس
وقت میری بد بختی سے نہ معلوم کیوں میری عقل کھو گئی تھی کہ میں ماں
کے دل کو زخمی کرنے کے گناہ کی مرتکب ہوئی۔ ایشور جانتا ہے کہ
میں اس کا افسوس میرے دل سے مرنے پر بھی کم نہ ہو گا۔ اسی لئے آج
میں سانس، خاوند، بیٹا اور گھر بار سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی
دوسرے کے ٹکڑوں پر پل رہی ہوں۔ میں ابلہ ہوں۔ آج ٹانگ سسرال
کا منہ نہ دیکھ سکی۔ میرا گناہ خواہ متا ہی بڑا کیوں نہ ہو، پھر بھی میں
اس گھر کی بھو ہوں۔ تم مجھ سے کیسے کہہ رہے ہو کہ میں بھکاریوں
کی مانند دن کے وقت لوگوں کے سامنے پیدل چل کر وہاں جاؤں
تمہیں اور کوئی صحیح راستہ مجھ میں نہیں آیا۔ کیوں مجھ میں نہیں
آیا؟ شاید اس لئے، کہ ہم لوگ بہت غریب ہیں، ہماری ماں نے
بھیک مانگ مانگ کر ہم دونوں بہن بھائیوں کی پرورش کی اور میرا

بھائی معمولی محنت مزدوری کر کے گھر کا گزارہ کرتا رہا۔ اس لئے تم نے بھی سوچا کہ اگر بھکاریوں کی لڑکی بھکاریوں ہی کی مانند تبدیل وہاں جائے تو اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ لیکن یہ صرف تمہاری بھاری غلطی ہی نہیں بلکہ ناقابل برداشت تو یہی بھی ہے۔ پس یہیں رہ کر بھٹو کی مرنادگی لیکن تمہارے سامنے ہاتھ پھیلا کر تمہاری فسی مذاق کا فٹ نہ نہیں بنوں گی؟

بندھا بن حیران ہو کر تھوڑی دیر کھڑا سنتا رہا اور پھر بولا —
”جاتا ہوں — اور تو کچھ نہیں کہنا؟“

کسم نے بھی اُسی طرح جواب دیا — ”جاؤ، لیکن ذرا ٹھیرو ایک بات اور رہے۔ مہربانی کر کے بھٹو نہ بولنا۔ کیا میرے چالی چلن کے متعلق تمہارے دل میں شک پیدا ہوا ہے۔ اگر ہوا ہو تو میں تمہارے سامنے کھڑی ہو کر قسم کھاتی ہوں کہ“

بندھا بن چند قدم آگے بڑھ گیا تھا، ٹک کر کھڑا ہو گیا اور حیران ہو کر درمیان ہی میں بول اٹھا — ”یہ کیا، فضول قسم کھاتی ہو؟ میں نے تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں سنا“ پھر اُس کے نیم وامنہ کی طرف دیکھ کر نرم لیکن استقلال کے لہجہ میں بولا ”اس کے علاوہ کسی کے چال چلن یا طرز عمل پر نگاہ رکھنا میری فطرت نہیں، اور یہ مناسب بھی نہیں سمجھتا۔ تمہارے طرز عمل اور کردار کے متعلق مجھے کوئی تردد نہیں اور نہ میں اُس کے متعلق کوئی تذکرہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔ میری

نگاہوں میں سب نیک اور پاک ہیں، تمہیں بھی بُرا نہیں سمجھتا۔“ یہ کہہ کر
 بندرا بن آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

کُتَم حیرت کسے مارے پتھر کے بُت کی طرح خاموش کھڑی رہی۔

چترن نے پوچھا۔۔۔۔۔ ”ماں ندی پر نہانے نہیں چلو گی؟“

کُتَم نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔۔۔ وہ اُسے لے کر آہستہ آہستہ

قدم اٹھاتی ہوئی اپنی کوٹھڑی میں جا کر چار پانی پر لیٹ گئی اور چترن
 کو خوب زور سے سینے کے ساتھ لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



نواں باب

بہت دن گزر گئے۔ ماگھ کا مہینہ ختم ہو کر پھانگن بھی آپہنچا۔ چرن اُس وقت کا گیا ہوا پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اُسے وہاں آنے سے زبردستی روکا گیا۔ یعنی وہ لوگ اب اس سے کسی طرح کا تعلق رکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ پھر کوئی خط بھی تو نہیں آیا۔ اس لئے اب اُس نے بھی اس بات کی قسم کھالی ہے کہ وہ بھی چھٹی لکھ کر اپنی تحقیر نہ کرائے گی۔ بھائی کا سلوک اب بھی ویسا ہی تھا۔ سب طرف سے گویا کُسم پر سبج و غم اور مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اس دوران میں اُس نے لوگوں کے سامنے باہر نہ نکلنا اور سکھی سہیلیوں سے ملنا جلنا بھی بالکل بند کر دیا تھا علی الصبح ہی وہ ندی پر جا کر نہا کر پانی بھر لاتی اور بازار کے دن گوپال کی ماں بازار سے سب سامان لادیتی۔ اس طرح اپنے آپ کو دُنیا سے الگ تھلگ کر لینے سے اُس کی مصیبت اور سیاہ بختی کے

لبے دن واقعی بڑی تکلیف سے گزرنے لگے ۔
 سسٹم سُنی کا کام بہت کر سکتی تھی۔ جو کوئی اُسے جتنی مزدوری دینا چاہتا تھا وہی لے لیتی۔ اور اگر کوئی اُسے مزدوری دینا بھول جاتا تو وہ بھی بھول جاتی۔ انہی صفات حسنہ کی وجہ سے ہاسٹل میں کمرہ داروں کی چادریں، ٹیکسوں کے خلاف، مسہریاں وغیرہ زیادہ تر وہی سیتی تھی۔ آج بعد دوپہر جب وہ آگن میں چٹائی بچھا کر ایک ناکمل مسہری کی تکمیل کرنے بیٹھی تو اُس کے ہاتھ کی سُنی رُک گئی۔ وہ اُسی پہلے دن کے واقع کو یاد کر کے اس حادثہ پر دل ہی دل میں غور کرنے لگی۔
 جس دن بند رابن بال پتھوں اور ماں کو ساتھ لے کر اُس کے بھگوانے بھائی کی دعوت کھانے آئے تھے اور بڑی مشکل میں گرفتار ہو کر شرم و حیا کو چھوڑ کر اُسے بیوی کی حیثیت میں پہلی دفعہ اپنے خاوند سے گفتگو کرنی پڑی تھی۔ اُس دن کی باتیں ایک ایک کر کے سینما کی متحرک تصاویر کی مانند اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگیں۔ جس وقت مصائب اُس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے تھے — تو اُس وقت وہ سب کام چھوڑ کر اسی ستر انگیز یاد کو لے بیٹھتی تھی۔ جس طرح ماں اپنے اکلوتے نو نال کو گود میں لے کر طرح طرح سے جھولا جھلا کر لاٹھپیار کرتی ہے، اُسی طرح وہ بھی اپنے سُکھ کی اس واحد یاد کو ناقابل بیان محبت کے اپنے دل میں جگہ دئے ہوئے تھی اور اس کی بدولت طرح طرح سے اپنے بے چین دل کو تسکین دینے

کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اُس وقت گویا اُس کا تمام دکھ دُور ہو جاتا۔ اُس دن دونوں کے باہمی سوال و جواب، سب سے چوری کھانے کا انتظام اور کھانا تیار کر کے اُور تھالیوں میں رکھ کر پتی اور دیہروں کو کھلانے، ساس کی خدمت، اور پھر سب سے آخر میں شام کے وقت آپ خود وہی باقی ماندہ جُھوٹا اور ٹھنڈا کھانا کھانا، یہ سب باتیں آج بھی حسب معمول مکتم کو یاد آگئیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے عورت کا جنم لے کر اس سے زیادہ سکھ کی بات نہ تو وہ سوچ ہی سکتی تھی اور نہ اُس کی ایسی خواہش ہی ہوتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ جو عورت ہر روز یہ کام کرتی ہے، اُس کے لئے اس دُنیا میں اس سے بڑھ کر اور کون سا سکھ ہے ؟

اس کے بعد اُس کو آخری دن کی بات یاد آئی جس دن وہ اُس سے سب تعلقات توڑ کر چلے گئے تھے۔ اُس دن اُس نے بھی انہیں نہیں منایا، بلکہ تعلق توڑنے میں مدد ہی دی۔ لیکن اُس وقت اُسے چرن کا خیال نہیں آیا تھا۔ غرور کی وجہ سے اُس وقت اُس کے دل میں یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اُس کے ساتھ ہی چرن بھی مجھ سے پھڑ کر دُور ہو جائیگا۔ اب مجھوں میں دن گزرتے جاتے تھے یہ خوف اُس کے خون کو خشک کر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چرن پھر یہاں آنے ہی نہ پائے۔ اگر واقعی وہ نہ آیا، تو میں اُس کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟ اور سب سے بڑھ کر افسوس کی بات یہ تھی کہ پہلے

اس کے دل میں پُرانی باتوں کے متعلق جو شک و شبہات تھے وہ اس مصیبت کے وقت بالکل ختم ہو گئے تھے۔ اس کے من کا سویا ہوا اعتماد اب بیدار ہو گیا تھا۔ اور اس کے کان میں کہا کرتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے، مایا ہے۔ اس کے بچپن کی بدنامی کا دھبہ، سب فرضی ہے کچھ بھی سچ نہیں۔ وہ ہندو لڑکی ہے، اس لئے کوئی گناہ اور بے انصافی کسی طرح بھی اُس کے دل میں داخل نہیں ہو سکتی۔ کسی غیر کی سیوا کرنے کے لئے اُس کا دل اتنا بے چین کبھی نہیں ہو سکتا۔ جان بوجھ کر ہو یا لاعلمی میں بہر حال ایک ہندو خاندان کی لڑکی اپنے بچے کے علاوہ کسی اور سے اتنی محبت کبھی نہیں کر سکتی۔ اگر وہ میرے بچے نہ ہوتے تو بھلاؤں یقیناً مجھے صحیح راہ دکھا دیتے۔ میرے دل کے کونے میں تھوڑی بہت شرم کا جذبہ پیدا کر دیتے۔

آج بازار کا دن تھا۔ گوپال کی ماں بہت دیر سے بازار گئی ہوئی تھی۔ اب آتی ہی ہوگی۔ اس لئے باہر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اتنے میں بابو کنج ناتھ نوکر کو ساتھ لئے بوٹ پہنے کھڑ بڑکھڑ بڑکی آواز سے پاس پڑوس کے لوگوں میں وقار اور رعب پیدا کرتے گھر میں داخل ہوئے۔ کسٹم نے سمجھ تو لیا۔ لیکن شرم کے مارے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں وہ اُدھر نہ اٹھا سکی۔

کنج ناتھ سیدھا بہن کے پاس پہنچ کر لولا — تمہارا بندہ رہا اب اور شادی کرنے لگا ہے!

کُسم کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی اور وہ پتھر کے بُت کی مانند خاموش بیٹھی رہی ۛ

کنج نے اپنی آواز کو ذرا آواز بلند کر کے کہا: اب میں بھی دیکھوں گا کہ مگر مجھ کے ساتھ عداوت بڑھا کر وہ کس طرح پانی میں رہتا ہے۔ اور میں یہ بھی دیکھوں گا کہ نندویشنو کتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے جو ہماری ہی زمینداری میں رہ کر ہماری ہی تختیر کرتا ہے؟

کُسم کو ان باتوں کا کچھ بھی مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ اُس نے بڑی حیرت سے پوچھا: ”نندویشنو کون ہے؟“

کنج نے جواب دیا: ”ہماری رعایا۔ ہمارے تالاب کے کنارے مکان بنا رہے۔ میں اُس کے گھر میں آگ لگاؤں گا اسی سالے کی لڑکی ہے۔ اسی پھاگن میں شادی ہوگی۔ سب فیصلہ ہو گیا ہے۔ بھوتا، ذرا حُفّہ تو بھر لا!“

کُسم نے ابھی تک آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ نوکر بھی ساتھ آیا ہے۔ وہ شرمناک بیٹھی رہی ۛ

کنج نے پوچھا: ”کیوں رہے بھوتا! نند کی لڑکی کیسی ہے؟“

بھوتا نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا: ”اچھی ہے!“

کنج نے تڑپ کر کہا: ”اچھی ہے؟ ہرگز نہیں۔ دیکھنے میں

ہماری بہن کی طرح ہے؟ دھت! تو نے کبھی ایسا حُصّ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟“

بھوتا کے جواب دینے سے پہلے ہی کُسم وہاں سے اُٹھ کر اندر چلی گئی
تھوڑی دیر بعد کُنج نے حقہ پیٹے پیٹے کُسم کی کوٹھڑی کے پاس آکر
کہا۔ ”کیوں، میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بند را بن دیلاگی کے برابر
نمک حرام اور بد ذات اور کوئی نہیں۔ کیوں، میری بات ٹھیک ہوئی نا؟
ماں کتنی ہے کہ وہ جھوٹا ہو سکتا ہے، لیکن میرے کُنج ناتھ کی بات کبھی
جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ کیوں بھوتا؟ ماں کہا کرتی ہے نا؟“

کُسم نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اندر سے ایک طرح کی مبہم سی
آواز سنائی دی۔ نہ معنوم کیا سوچ کر کُنج حقہ رکھ کر دروازہ کھول کر
کوٹھڑی کے اندر جا کھڑا ہوا۔

کُسم چارہ پانی پر اوندھے منہ بڑی تھی۔ کُنج ناتھ تھوڑی دیر اُس کی
طرف دیکھتا رہا۔ آج بہت دنوں کے بعد اچانک اُس کی آنکھوں سے
آنسو بہنے لگے۔ انہیں ناتھ سے پہنچ کر وہ آہستہ آہستہ چارہ پانی
کے ایک کونے پر جا بیٹھا اور اپنی بہن کے سر پر ناتھ رکھ کر آہستہ
سے بولا۔ ”کُسم، اُم کسی طرح کی فکر نہ کرو۔ خواہ کچھ ہو جائے، میں یہ
شادی کبھی نہ ہونے دوں گا۔ تم دیکھ لینا کہ تمہارا بھتیجا جو کچھ زبان سے
کہتا ہے وہ کرتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن بہن تم بھی تو سُسرال جانے پر
کسی طرح رضا مند نہ ہوئیں۔ ہم لوگوں نے کتنی کوشش کی، تمہیں کتنا
سمجھایا۔ لیکن تم نے کسی کی بات پر دھیان ہی نہ دیا۔“ آخری الفاظ
کہتے کہتے کُنج کا گلا بھر آیا۔

اب کُسم اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت دیر سے اُس کی یہ اُمید ٹوٹ چکی تھی کہ بھائی کے دل میں بھی میرے لئے ذرہ بھر محبت موجود ہے۔

کنج کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور وہ چپ چاپ بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسکین دینے لگا۔
شام ہو گئی۔ کنج نے پھر ایک دفعہ کوٹ کی آستین سے آنسو صاف کر کے کہا۔۔۔ ”بہن گھبراؤ نہیں۔ میں کہے دیتا ہوں کہ یہ شادی کسی طرح بھی نہ ہونے دوں گا۔“

اب کُسم بولی۔ اُس نے روتے ہوئے کہا: ”نہیں بھتی، تم اس میں روکاؤ نہ ڈالنا۔“

کنج نے حیرت زدہ ہو کر پاؤں چھائے کیا کہا؟ میں مخالفت نہ کروں؟ ہم لوگوں کی آنکھوں کے سامنے شادی ہوا اور ہم خاموش کھڑے تماشا دیکھتے رہیں؟ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟

کُسم نے جواب دیا۔۔۔ ”نہیں بھتی، تم اس میں روکاؤ نہ ڈالنا۔“
کنج نے بگڑ کر کہا۔۔۔ ”روکاؤ نہ ڈالنا؟ ضرور

ڈالوں گا۔ اس میں میری بے عزتی نہ ہو تو نہ سہی، لیکن میری بے عزتی تو ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ وہ ہماری رعایا ہے۔

تم کہتی کیا ہو؟ لوگ سنیں گے تو ہم پر تھوکیں گے نہیں؟“
کُسم تکیے میں منہ چھپا کر اور بار بار سر ہلا کر کہنے لگی۔ ”بھتی!

میں تبہیں منع کرتی ہوں۔ تم اس کی مخالفت نہ کرو۔ ہم لوگوں کے ساتھ
اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ لڑائی جھگڑا کر کے بدنامی کے داغ کو اور نہ بڑھانا۔
بیاہ ہوتا ہے تو ہوا کرے“

کنج نے غصے میں بھر کر جواب دیا۔ ”نہیں“

”نہیں کیوں؟ مجھے چھوڑ کر پہلے بھی تو اُس نے ایک شادی کر لی تھی۔

اب ایک اور کرے۔ ہم لوگوں کے لئے دونوں ہی برابر ہیں۔ بھتیجا! میں
تمہارے پاؤں پڑتی ہوں، بے فائدہ مخالفت کر کے اور جھگڑا بڑھا کر
میری توہین نہ کراؤ۔ مجھے جس بات میں سکھ ہے وہی ٹھیک ہے“

کنج پہلے تو خاموش بیٹھا رہا، پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا۔
”مجھے تو میں ہمیشہ سے جانتا ہوں۔ ایک دفعہ منہ سے جو نکل گیا، پھر
کس کے باپ کی مجال ہے جو مجھ سے ہاں کہلو اسکے۔ تو کسی کی بھی
بات نہ مانے گی۔ تیری ہی بات سب کو ماننی پڑے گی“

کُسم خاموش رہی۔

کنج ناتھ نے پھر کہا۔ ”اور ویسے تمہاری بات غلط بھی نہیں،
جب تم کسی طرح سسرال جاؤ گی ہی نہیں تو اُن کا گھر کیسے چلے گا؟
ابھی تو خیر بندہ رابن کی ماں ہے لیکن وہ ہمیشہ تو بیٹھی نہیں رہے گی“

کُسم نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔
کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کنج اچانک بول اٹھا۔
”اچھا کُسم، وہ شادی کریں یا نہ کریں، لیکن یہ تو بتاؤ کہ اتنا روٹی

”کیوں ہو؟“

بھلا کُتَم کے پاس اس کا کیا جواب تھا ؟
تاریکی کی وجہ سے کُنچ پتہ دیکھ سکا، کہ کُتَم کے آنسو جو کم ہو گئے تھے، اس
سوال کے بعد پھر بڑے زور سے بہنے لگے ۔

کُنچ کے چلے جانے کے بعد اُس دن کی باتیں یاد کر کے شرم اور افسوس
کی وجہ سے کُتَم دل ہی دل میں ندامت محسوس کرنے لگی ۔ ”چھی ! مر جانے
کے بعد بھی تو اس ندامت سے چُٹھکا رہے گا کوئی ذریعہ نہیں ۔ اسی لئے
تو مجھے امداد دینا اُن کے بس کی بات نہ تھی، حالانکہ میں نے کتنی خوشامد کی
تھی ۔ ادھر جب دوسری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں ۔ اُس وقت
میں نے بڑے فخر سے اپنے آپ کو اُن کے گھر کی ہُو بتایا تھا، جن کے دل
میں میرے لئے ذرہ بھر بھی محبت اور احترام نہیں تھا ۔ ان پر میں نے اتنا
بڑا غرور کیا تھا ۔ ایشور ! اس ناقابل برداشت مصیبت میں تم نے اس
روحانی ندامت کا اضافہ کیوں کر دیا ؟“

اُس نے ایک سرد آہ کھینچی ۔ ”اوہ ! اب سمجھی، اسی لئے انہیں میرے
عادات اور کریکٹر کے لئے ذرا بھر بھی فکر نہیں ۔ اور اس کے باوجود میں
بے عیاں قسم کھانے لگی تھی“ ۔

دسواں باب

بند ران ایسی فطرت کا آدمی تھا جو کسی بھی حالت سے متاثر ہو کر ناراض ہونا یا گھبرا جانا باعثِ شرم سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ ہزار بار ناراض ہونے پر بھی اپنے آپ کو سنبھال سکتے ہیں، اور خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اپنے مخالف سے گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑا کر کے لوگوں کو تماشا نہ نہیں دکھاتے۔ لیکن اس کے باوجود کسٹم کے بار بار کے ناروا سلوک اور جھوٹے الزامات سے گرم اور ناراض ہو کر وہ کئی فضول باتیں کہہ آیا تھا، جس کے لئے بعد میں اسے شدید ذہنی کوفت محسوس ہوئی۔ اسی لئے دوبارے دن چرن کو بلانے کے بہانے اُس نے نوکرائی کو نوکر کے ساتھ صبح ہی گاڑی بھیج دی۔ اس امید میں کہ شاید سمجھاؤ کسٹم یہ اشارہ سمجھ جائے گی اور چرن کے ساتھ خود بھی چلی آئیگی۔ اگر وہ واقعی آ جائے، تو پھر کیا صورت حال درپیش ہوگی اور اس کی رہائش کا کیا انتظام ہوگا۔ اس مشکل سوال کو اُس نے اس طرح حل کر لیا، کہ اگرچہ آگئی تو گھر میں ماں خود ہی سب ٹھیک

کر لے گی ۛ

اپنی ماں کی عقلمندی اور ہشیاری پر اُسے پورا اعتماد تھا۔ خواہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ آپڑے، ماں کسی نہ کسی طرح کوئی راہ نکال لے گی۔ اور وہی کام کرے گی، جس میں سب طرح سے بھلائی ہو۔ اسی اعتماد پر اُس نے ماں سے بغیر کوئی چھپے ہی گاڑی بھیج دی تھی۔ امید، مسرت، شرم اور یاس کے ملے جلے جذبات سے بے چین ہو کر وہ راہ دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم ماں سے معافی مانگنے وہ ضرور اُٹے گی ۛ

دوپہر کو گاڑی اکیلے چرن کو لے کر واپس آئی۔ بندرا بن چنڈی منڈپ کے اندر ہی سے چرن کو تنہا دیکھ کر خاموش ہو رہا۔ ادھر چند دنوں سے بندرا بن کی پانٹھ سالہ میں پہلے کی مانند باقاعدگی نہیں رہی تھی۔ پنڈت جی کی بے دلی اور بے پروائی کی وجہ سے بہت سے طالب علموں نے پانٹھ سالہ میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ اور جو آتے بھی تھے اُن کا تمام دن تالاب پر غرق صاف کرنے ہی میں گزر جاتا تھا۔ ٹھا کڑی کی آرتی کے بعد جو پرشاد کھانے کو بلا کرتا تھا، صرف اُسی کی باقاعدگی قائم تھی۔ طالب علم اُس وقت غیر حاضر رہ کر شاید گورنگ پر بھوکے اصول کو توڑنا نہیں چاہتے تھے ۛ

اسی دوران میں بندرا بن نے ایک دن اچانک ہی اپنی پانٹھ سالہ کی طرف لبھوری پوری توجہ دینی شروع کر دی۔ لڑکوں کو تنہی صاف

کرنے میں پہلے جو چھ گھنٹے لگا کرتے تھے، انہیں گھٹا کر پندرہ منٹ کر دیا اور اس بات پر بھی اچھی طرح نظر رکھی کہ وہ دن بھر غائب رہنے کے بعد صرف آرتی کے وقت ہی ٹھا کر پریم سے متاثر ہو کر بڑی دل کی مانند مندر میں جمع نہ ہو جایا کریں +

قریباً دو دن کے بعد ایک دن بندرا بن نے دوپہر کے بعد لڑکوں کو پہاڑے پڑھانے کے لئے ایک قطار میں کھڑا کیا۔ لڑکے زور زور سے چلا کر پہاڑے بولنے لگے۔ اتنے میں ایک شریف آدمی ہال پہنچے۔ بندرا بن فوراً اٹھ کر انہیں بیٹھنے کے لئے آسن دیا اور ان کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ انہیں پہچان نہیں سکا تھا۔

مہمان قریباً اُنہی کی عمر کا تھا۔ وہ آسن پر بیٹھ کر ہنستا ہوا بولا: ”کیوں بھائی مجھے پہچانا نہیں؟“

بندرا بن نے کچھ شرمندہ ہو کر جواب دیا: ”نہیں“۔ وہ بولا: ”میں جس کام کے لئے آیا ہوں وہ پھر بتاؤنگا۔ باموں جی نے اپنی ایک چٹھی میں آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ پر دس جانے سے پہلے ایک دفعہ آپ سے ملاقات کر لوں۔ میرا نام کیشب ہے۔“

بندرا بن نے دوڑ کر اپنے بچپن کے ساتھی کو گلے سے لگا لیا۔ وہ اُس کے انگریزی کے اُستاد بابو دُرگا داس کا بھانجا تھا۔ اُس زمانے میں اُن کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ بابو دُرگا داس کی بیوی کی وفات کے

بعد کیشب وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی اُن کی آپس میں ملاقات نہ ہوئی۔ لیکن دونوں میں سے کوئی بھی کسی کو بھولا نہیں تھا اور بندرا بن کو اپنے ماسٹر صاحب سے عموماً اپنے بچپن کے دوست کی خیر و عافیت کی اطلاع مل جایا کرتی تھی +

پانچ چھ سال ہوئے کیشب ایم۔ اے پاس کر کے ایک کالج میں پروفیسر ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی سرکاری کام سے لائیت جلا رہا تھا۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد کیشب نے کہا: بھوٹ بولنا تو دُور رہا، میرے ماموں جی کبھی کوئی بات بڑھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ پچھلی دفعہ انہوں نے چٹھی میں لکھا تھا کہ زندگی میں بہت سے شاگردوں کو پڑھایا ہے۔ لیکن یاد نہیں آتا کہ بندرا بن کے علاوہ اور بھی کوئی حقیقی معنوں میں انسان بنا ہو۔ آج تک اپنی آنکھوں سے کارمل انسان نہیں دیکھا۔ اس لئے میں وطن چھوڑنے سے پہلے ایک بار ملاقات کرنے چلا آیا ہوں +

اگرچہ یہ بات ایک دوست کے مُنہ سے نکلی تھی پھر بھی بندرا بن اس قدر شرمندہ اور حیران ہوا کہ بہت دیر سوچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کا کیا جواب دے۔ اُسے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ دُنیا میں کوئی آدمی اس کی اتنی تعریف کریگا، اور خاص کر وہ اس بات سے اور بھی حیران رہ گیا کہ یہ تعریف سب سے پہلے اُس کے قابلِ احترام اُستاد کے مُنہ سے نکل کر مشہور ہوئی تھی +

کیشب اُس کے دل میں پیدا ہونے والے مرو جڑ کو دیکھ کر بولا۔
 ”اچھا بھائی، جانے دو۔ جس بات سے تم شر مار رہے ہو، اُسے اب میں نہیں
 کہوں گا۔ یہ تو صرف ماموں جی کا خیال تمہیں بتایا ہے۔ اب کام کی بات
 کہتا ہوں۔ تم نے پاٹھشالہ کیوں کھولی ہے؟ سنا ہے کہ لڑکوں سے فیس
 بھی بالکل نہیں لیتے ہو اور لڑکوں کی کتابوں، کاپیوں اور کپڑوں کا انتظام
 بھی تم اپنے ہی پاس سے کرتے ہو؟ ان سب کے لئے تو میں بھی تیار تھا،
 لیکن لڑکے اکٹھے کرنے میں ناکام رہا۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اتنے لڑکے
 تم نے کیسے اکٹھے کر لئے؟“

ہندرا بن اُس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اس لئے خاموش اُس کے مُنہ
 کی طرف دیکھتا رہا۔

کیشب ہنستے ہوئے بولا۔ ”اچھا، اب میں صاف صاف
 کہتا ہوں۔ تاکہ تم اچھی طرح سمجھ سکو۔ اب سب لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے
 کہ ملک میں اگر کوئی کام سب سے ضروری ہے، تو وہ یہ ہے کہ دیہات
 کے غریب اور نا تعلیم یافتہ کسانوں کے بچوں کو تعلیم دی جائے۔ تعلیم دینے
 کے علاوہ خواہ ہم اور کتنے ہی کام کریں، وہ سب فضول ہیں۔ کم سے کم میرا
 تو یہی خیال ہے کہ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو، پھر وہ اپنی فکر آپ
 کریں گے۔ انجن اُسی وقت چلتا ہے، جب اُس میں بھاپ ہوتی ہے،
 ورنہ اتنی بڑی چیز کو چند آدمی صرف اپنی جسمانی طاقت سے ایک انجن
 بھی نہیں دھکیل سکتے۔ یہ تو خیر تم سب جانتے ہی ہو، ورنہ اپنی جیب سے

پیشہ خرچ کر کے یہ پاٹھشالہ نہ کھولتے۔ میں نے اسی لئے شادی تک بھی نہیں کی۔ تمہاری مانند ہمارے گاؤں میں بھی کوئی پاٹھشالہ نہیں۔ اسی لئے پہلے ایک پاٹھشالہ کھول کر اُسی کو بعد میں سکول بنانے کا خیال تھا۔ لیکن وہ پاٹھشالہ کامیاب نہ ہوئی۔ لڑکے آئے ہی نہیں۔ ہمارے گاؤں کے چھوٹی جاتی کے لوگ ایسے شیطان ہیں کہ وہ کسی طرح بھی اپنے لڑکوں کو پرھانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ میں اپنی عزت آبرو کو چھوڑ کر کئی دنوں تک اُن لوگوں کے گھر گھر گھوم کر خشک گیا، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا:

بند را بن کا منہ سُرخ ہو گیا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”چھوٹی جاتی کے لوگوں کی تقدیر ابھی تھی کہ انہوں نے بڑے آدمیوں کی پاٹھشالہ میں اپنے لڑکے نہیں بھیجے۔ لیکن تمہارا بھی بھائی، ہم جیسے چھوٹے آدمیوں کے گھر گھر گھوم کر اپنی عزت، آبرو کھونا ٹھیک نہیں تھا۔“

بند را بن کی بات میں جو طنز کا تیر پنہاں تھا وہ کیشب کے دل میں لگا اور وہ گھبرا کر بولا۔ ”نہیں بھائی، نہیں تم کو۔۔۔ تم لوگوں کی بات تھوڑی ہی ہے۔ رام رام! میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم جانتے ہو۔“

بند را بن ہنس پڑا۔ بولا۔ ”یہ میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے مجھے نہیں کہا۔ تم نے میرے دوسرے جانی بھائیوں کو کہا ہے۔ ہم سب جو لاپسے، لوٹا، گوالے، کسان۔۔۔ کر گھا چلاتے، ہل جوتتے، مویشی

چراتے اور کھیتی باڑی کرتے ہیں قیمتی کپڑے نہیں پہنتے، سرکاری دفاتروں میں نہیں جاسکتے۔ اسی لئے آپ لوگ ہمیں چھوٹے آدمی کہتے ہیں۔ کسی اچھے کام کے لئے ہمارے گھروں میں آنے سے آپ جیسے تعلیم یافتہ، اور اونچی جاتی کے لوگوں کی عزت آبرو میں فرق پڑتا ہے۔“

کیشب نے سر جھکا کر کہا — ”بھائی بند رابن! میں سچ کہتا ہوں، کہ میں نے تمہیں لسانوں اور گوالوں سے بالکل الگ سمجھ کر ہی یہ بات کہی تھی۔ اگر مجھے یہ بات معلوم ہوتی کہ تم اپنے آپ کو بھی انہی لوگوں میں شامل کر کے ناراض ہو جاؤ گے، تو میں کبھی یہ بات منہ سے نہ نکالتا۔“

بند رابن نے جواب دیا۔ ”یہ بھی میں جانتا ہوں۔ لیکن تمہارے الگ سمجھنے ہی سے تو میں الگ نہیں ہو سکتا۔ بھائی میری سات پشتیں اس ملک کے محنت پیشہ چھوٹے لوگوں کے درمیان گزری ہیں میں بھی اپنے ہاتھ سے ہل جوتا ہوں۔ کیشب اسی لئے تمہاری پاٹھشالہ میں لڑکے نہیں آتے، اور میری پاٹھشالہ میں آ جاتے ہیں۔ میں انہی لوگوں میں رہ کر بڑا ہوا ہوں۔ اسی لئے وہ لوگ بغیر شش و پنج کے میرے پاس آ جاتے ہیں۔ تمہارے پاس جانے کی ان میں ہمت نہیں پڑتی۔ ہم لوگ جاہل اور غریب ہیں۔ ہم لوگ آپ لوگوں کی مانند غرور نہیں کرنے۔ آپ لوگ ہمیں بیچ کہہ کر پکارتے ہیں اور ہم چپ چاپ منظور کر لیتے ہیں۔ لیکن ہماری روح اُسے تسلیم نہیں کرتی، ہمارا ضمیر

بغاوت کرتا رہے۔ اور وہ آپ لوگوں کی لکشمی باتوں سے بھی ٹپس سے
میں نہیں ہوتا۔“

کیشب شرمندہ ہو کر چپ چاپ منتظر رہا ۔

بند رابن نے پھر کہنا شروع کیا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اس میں
ہمارا ہی نقصان ہے۔ پھر بھی آپ لوگوں کو اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتے
ہوئے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ ہم لوگوں میں نیم حکیم اور لال
بجھکر ہی عزت پاتے ہیں۔ جس طرح میں نے پانی پیا ہے۔ لیکن آپ جیسے
بڑے بڑے ڈاکٹروں اور پروفیسروں کی ایک نہیں چلتی۔ ہمارے
دل میں نبی نوع انسان کے لئے جذبہ محبت موجزن ہے۔ اور آپ کی
اس جھوٹی ہمدردی اور رحمہ دلی سے اُس کو ٹھیس پہنچتی ہے۔“

اس دفعہ کیشب نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ لیکن منہ پھیر لینا
نا انصافی ہے۔ درحقیقت ہم لوگ آپ لوگوں سے نفرت نہیں کرتے۔
تمہاری بھلائی کرتے ہیں۔ تم لوگوں کے لئے بھی مناسب ہے کہ ہم پر
اعتماد کرو۔ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں
کہ کس کام میں تمہاری بہتری ہے اور کس میں نہیں۔ تم لوگ اپنی آنکھوں
سے بھی دیکھتے ہو کہ ہم سبھی باتوں میں ترقی یافتہ ہیں۔ اس حالت میں
آپ لوگوں کے لئے مناسب ہے کہ ہماری باتیں کان لگا کر سنو۔“

بند رابن نے کہا۔۔۔۔۔ دیکھو کیشب، میرے دل کے دیوتا

کیوں منہ پھیر لیتے ہیں، یہ تو دیوتا ہی جانیں۔ اس بات کو جانے دو۔

لیکن آپ لوگ ہماری بھلائی اپنے بھائی سمجھ کر نہیں کرتے، بلکہ اپنے غلام سمجھ کر
 کرتے ہیں۔ اس لئے تم لوگوں میں روپے میں سے پندرہ آنے آدمیوں
 کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے لڑکوں کی بھلائی ہو اور بیچ جاتی کے
 غریب بچوں کی زندگی برباد کی جائے۔ آپ لوگوں کے زیر سایہ رہ کر
 اور لکھنا پڑھنا سیکھ کر ایک کسان کا لڑکا جب بابو بن جاتا ہے تو وہ
 اپنے جاہل باپ دادا کی پروا نہیں کرتا، عزت نہیں کرتا۔ تعلیم کے
 اس آخری انجام کا مجرم ہم آپ کو اور آپ کی تعلیم اور تربیت کو، ہی
 گردانتے ہیں۔ کیشب، پہلے تم ہم لوگوں کے — یعنی چھوٹی جاتی
 کے لوگوں کے ہمدرد بننا سیکھو، اور پھر اس کے بعد ان کی بھلائی کی
 فکر کرو اور ان کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے آؤ۔ پہلے
 اپنے طرز عمل سے یہ دکھا دو کہ تم پڑھے لکھے بڑے آدمیوں کی علیحدہ
 جماعت نہیں۔ تعلیم یافتہ ہو کر بھی تم ملک کے ان پڑھے گنوار کسان
 اور مزدور بچوں کو بیچ اور چھوٹے نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کی عزت کرتے ہو
 اور ان سے محبت کرتے ہو۔ پھر نہیں ہم لوگوں کو یقین آئیگا کہ ہمارے
 بچے بھی پڑھ لکھ کر ہماری بے ادبی اور بے عزتی نہیں کریں گے۔
 ہمارا ادب، اور احترام کریں گے۔ اور جاتی کو چھوڑ کر، سماج کو چھوڑ کر،
 بزرگوں کے رسم و رواج اور کاروبار کو چھوڑ کر ہم سے علیحدہ ہونے
 کے لئے بے چین نہ ہوں گے، جب تک آپ ایسا نہیں کرتے اُس وقت

تک آپ ہزار بار پیدا ہوں، مریں اور مجھ دورہ کر اپنی زندگی برباد کریں آپ لوگوں کی پاتھشالاؤں میں چھوٹی جاتی کے بچے نہیں آئیے۔ چھوٹے آدمی تعلیم یافتہ بڑے آدمیوں سے ڈرتے ہی رہیں گے وہ آپ کی عزت کریں گے، عقیدت اور احترام بھی کریں گے، لیکن اعتماد نہیں۔ اور نہ آپ کی بات سنیں گے۔ اُن کے دل سے یہ شبہ کبھی اور کسی طرح دُور نہ ہو گا کہ آپ لوگوں کی بہتری اور اُن لوگوں کی بہتری دونوں ایک نہیں۔“

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کیشب نے کہا —
 ”بند رابن! معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری ہی بات درست ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر دونوں جماعتوں میں اعتماد کا رشتہ ہی نہ رہے تو خواہ ہم لوگ اُن کو اپنا بنانے کی ہزار ہا کوششیں کیوں نہ کریں، پھر بھی اُن کا مفید نتیجہ برآمد نہ ہو گا۔ جب تک آپ لوگ اعتماد نہ کریں گے اُس وقت تک ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے اپنے ہیں یا پرانے؟“

بند رابن نے جواب دیا ”یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آپ یہ اعتماد اپنے طرز عمل سے ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے تمام اعمال و افعال کو تمہارے تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت مجھے رسم و راج کہہ کر چھوڑ دے، ہماری جائے قیام، ہماری فطرت، ہمارے عادات و خصائل، اور حصول معاش کے ذرائع اگر آپ لوگوں سے مختلف ہوں“

تو ہم لوگ کبھی بھی ماننے کے لئے تیار نہ ہونگے کہ آپ نے ہماری بھلائی کا جو کام شروع کیا ہے وہ ہمارے لئے واقعی سودمند ثابت ہو گا۔ اچھا کیشب! یگیو پوت پننے کے بعد تم ہوں سندھیا کرتے ہو؟“

”نہیں۔“

”جوتاپنے پانی پیتے ہو؟“

”ہاں پیتا ہوں!“

”عیسائیوں کے ہاتھ کا بنا کھانا؟“

”ہاں کھا سکتا ہوں۔ کوئی بُری بات نہیں ہے۔“

”تو پھر میں کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا چھوٹے آدمیوں کے پتھوں کے لئے پاٹھسالہ کھول کر تعلیم دینے کا خیال ایک دھوکا ہے، اور شاید اس سے بھی کچھ زیادہ ہے، اگر میں وہ کہہ دوں تو ناراض تو نہ ہو گے؟“

”ڈھٹائی؟“

”ٹھیک ہی۔ کیشب! صرف خواہش اور دلی تمنا ہی سے دوسروں کی بہتری یا ملکی خدمت کا کام نہیں کیا جاسکتا۔ تم جس کا بھلا کرنا چاہتے ہو، اُس کے ساتھ رہنے کی تکلیف بھی تمہیں برداشت کرنی پڑے گی۔ اگر عقلمندی اور دھرم کرم میں تم بہت آگے بڑھ جاؤ گے، تو تم ان کی دسترس سے باہر ہو جاؤ گے اور وہ تمہاری دسترس سے اور ہاں ذرا ٹھہرو! شام ہو رہی ہے کچھ پاٹھسالہ کا کام کر لوں۔“

”اچھا کرو۔ میں کل شیخ آؤنگا۔“

یہ کہہ کر کیشب جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ بندرا بن نے زمین بوس ہو کر اُس کے پاؤں چھوئے اور پاؤں کی دھول اٹھا کر اپنی پیشانی پر لگائی، دیہات میں گھر ہونے پر بھی کیشب کی بود و باش زیادہ تر شہر ہی میں تھی۔ اپنے دوست کے اس سلوک سے دل ہی دل میں اُسے بہت شرم محسوس ہوئی دونوں کے آنگن میں آتے ہی پاٹھشالہ کے لڑکوں نے زمین پر پیشانی ٹیک کر پر نام کیا،

اپنے بچپن کے ساتھی کے ساتھ دروازے تک جا کر اُس نے آہستہ سے کہا: ”دوست ہونے کے باوجود تم براہمن ہو، اس لئے تمہیں اپنی طرف سے بھی پر نام کرتا ہوں اور سب لڑکوں کی طرف سے بھی، سمجھ گئے نا؟“

کیشب نے شرمناک مسکراتے ہوئے کہا: ”ہاں، سمجھ گیا“ یہ کہہ کر آہستہ آہستہ قدم رکھتا باہر نکل گیا۔

دوسرے دن صبح ہی کیشب نے آکر کہا: ”بھائی بندرا بن! اب مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں رہا کہ تم واقعی انسان ہو۔“ بندرا بن نے ہنستے ہوئے کہا: ”مجھے بھی نہیں رہا! پھر؟“

کیشب نے جواب دیا: ”بھائی میں تمہیں اپدیش نہیں دیتا، میرا وہ کبیرا نکل ٹوٹ گیا۔ اب میں بحیثیت ایک دوست کے مؤذبانہ پوچھتا ہوں کہ اس گاؤں میں تو تم اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے اور اپنا وقت ضائع کر کے تعلیم دیتے ہو، لیکن اور بھی تو سینکڑوں ہزاروں گاؤں بڑے ہیں،

جہاں الف، ب پڑھانے کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ کیا یہ کام گورنمنٹ کو نہ کرنا چاہیئے؟“

بندر ابن ہنس پڑا۔ تمہارا سوال تو بالکل بچوں ایسا ہے۔ کسی قصہ کے بدلے اگر رادھا کو مارنے جاؤ، تو وہ فوراً ہاتھ اُٹھ کر کہے گا، پنڈت جی مادھو نے بھی قصور کیا ہے۔ گویا مادھو کا قصور بتانے پر پھر رادھا کا کوئی قصور نہیں رہ جاتا۔ بھائی! پہلے ہم اپنے منہ میں پھیلی ہوئی جہالت کو دُور کر کے اپنا فرض پورا کر لیں، پھر دیکھیں گے کہ گورنمنٹ اپنا فرض پورا کرتی ہے یا نہیں۔ اپنے فرض کو ادا کرنے سے پہلے دوسرے کے فرائض پر بحث کرنا گناہ ہے۔“

”لیکن، ہماری تمہاری طاقت ہی کتنی ہے؛ اس چھوٹی سی پاٹھشالہ میں چند بچوں کو پڑھانے سے کتنا فائدہ ہو گا؟“

بندر ابن نے حیرت سے تھوڑی دیر تک اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔
 ”نہیں بھائی! آپ کی یہ بات ٹھیک نہیں۔ ہماری پاٹھشالہ کا ایک طالب علم بھی اگر حقیقی معنوں میں انسان بن جائے تو وہ تیس کروڑ انسانوں کی اصلاح کر سکتا ہے۔ نیوٹن، فریڈے، رام موہن اور ودیا ساگر ایسے لوگوں کے گروہ پیدا نہیں ہو سکتے۔ آپ میرے لئے دعا کریں کہ میں مرے سے پہلے ایک بچے کو ہی حقیقی معنوں میں انسان بنا دیکھ پاؤں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ میری پاٹھشالہ میں ایک شرط بھی ہے۔ اگر کل شام آپ یہاں رہتے تو دیکھتے کہ ہر روز گھر جانے سے پہلے ہر بچہ

اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ میں بڑا ہو کر کم از کم ایک دو بچوں کو لکھنا پڑھنا ضرور سکھاؤں گا۔ ہمارے ہر پانچ بچوں میں سے اگر ایک بچہ بھی بڑا ہو کر اپنے بچپن کے عہد کو پورا کرے تو میں نے حساب لگا کر دیکھا ہے کہ بیس سال کے بعد اس ملک میں ایک بھی جاہل یا غیر تعلیم یافتہ نہ رہے گا۔“

کیشب نے سردارہ بھر کر کہا۔ ”اُف! اتنی لمبی اُمید!“
 بندرا بن نے جواب دیا۔ ”ہاں، تم یہ کہہ سکتے ہو کبھی کبھی مجھے بھی یہ سوچ کر خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں میرا یہ سُہری خواب، خواب ہی ثابت نہ ہو، لیکن اُس وقت بھی روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن دُور سے چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اور میرا بس کی گہرائیوں میں ڈوبنا ہوا دل اُمید کی روشنی سے معمور ہو جاتا ہے۔ اگر بھگوان کی نظر کرم ہو تو اُمید کو پورا ہوتے دیر ہی کتنی لگتی ہے!“
 کیشب نے جواب دیا۔ ”بندرا بن! مجھے آج ہی مادرِ وطن کو چھوڑ کر یورپ جانا ہے۔ ایشور جانے، ہم لوں گی ملاقات کب ہو۔ اگر مین جٹھی لکھوں تو جواب دو گے نا؟“

”یہ کون سی بڑی بات ہے کیشب؟“
 ”بڑی بات بھی کہتا ہوں، اگر کبھی دوست کی ضرورت پڑے، تو کیا مجھے یاد کرو گے؟“

”ہاں، ضرور کروں گا۔“ کہہ کر بندرا بن نے کیشب کے پاؤں کی دھول پیشانی پر لگالی۔

گیارہواں باب

بندرا بن کی ماں کرشن جنم کشمی کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا کرتی تھی۔ وہ کل ہی ختم ہوا تھا۔ اس لئے تھکا ماندہ ہونے کے سبب بندرا بن آج کافی دن چڑھنے کے باوجود ابھی سوکر نہیں اٹھا تھا۔ ماں ٹھوڑے پر سے پکار کر کہا۔ ”بیٹا بندرا بن! جلدی اٹھ کر فوراً باہر تو آؤ“

ماں کی آواز میں گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر بندرا بن فوراً بستر سے اٹھ بیٹھا اور پوچھا۔ ”ماں! کیا ہے؟“

ماں دروازے کے پاس آ کر بولی۔ ”بیٹا میں تو پہچانتی نہیں تمہاری پانٹھ سالہ کا کوئی لڑکا باہر بیٹھا زور زور سے رورہا ہے۔ اُس کے باپ کو ہیضہ ہو گیا ہے، اور اس کی حالت خراب ہے۔“

بندرا بن فوراً اٹھ کر باہر آ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی شب تو گوالے کے لڑکے نے روتے ہوئے کہا۔ ”پنڈت جی! بابو جی نہ تو آنکھیں کھولتے ہیں اور نہ کچھ بولتے ہی ہیں۔“

بند رابن نے محبت سے اُس کے آنسو پونچھ کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے کر اُس کے گھر جا پہنچا۔ شبتو کا آخری وقت آپہنچا تھا ہر سال انہی دنوں میضے کی وبا پھوٹ بڑھتی تھی۔ اس سال سب سے پہلے اُس کا شکار شبتو تھا۔ کل رات کو اسے ہیضہ ہوا۔ اس وقت تک بغیر علاج معالجہ کے وہ بچارا دم توڑتا رہا اور بند رابن کے آنے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

عموماً بنگال کے تمام دیہات میں کوئی نہ کوئی ایسا ڈاکٹر ضرور ہوتا ہے جو خود ہی تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن بیٹھتا ہے۔ اس گاؤں میں بھی گوہال نامی ایک ڈاکٹر تھا۔ کل رات اُسے بلایا گیا تو میضے کا نام سننے ہی اُس نے دور روپے نقد فیس طلب کی۔ اپنے وسیع تجربہ کی وجہ سے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان وبائی بیماریوں میں ادویہ کار کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی دوا کھا کر شوہر لوگ دوسرے دن فیس ادا کرنے کے لئے زندہ نہیں رہتے۔ شبتو کی عورت اتنی رات کو نقد روپوں کا انتظام نہ کر سکی۔ اس لئے مجبور ہو کر اس نے اپنے خاوند کو نمکین پانی پلانے اور ساری رات اُس کے سر ہانے بیٹھ کر شبتو کی دہلی سے اس کی صحت کے لئے دُعا میں مانگنے پر ہی اکتفا کی۔ حتیٰ کہ اس کی بھی کوئی ضرورت نہ رہی اور کھیل ختم ہو گیا۔

بند رابن امیر آدمی تھا۔ اس گاؤں کے تمام لوگ اُس کی عزت کرتے تھے۔ اپنے مرحوم خاوند کی تجہیز و تکفین کے لئے شبتو کی بیوہ اُس کے

پاؤں پکڑ کر رونے لگی۔ شبتو کی جائدا دھتی اُس کے ناتواں سٹو کھے ہوئے ہاتھ
 اورد وگائیں۔ بیوہ بیچاری انہی دو گایوں میں سے ایک کو رہن رکھ کر
 اس مصیبت سے نجات پانا چاہتی تھی۔ لیکن بندرا بن نے اس کے بغیر ہی
 تجمیز و تکفین کا انتظام کر دیا۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ اکثر ایسے ہی
 کیا کرتا تھا۔ شام کو بندرا بن براہے میں چٹائی بچھا کر آنکھیں بند کئے سو رہا
 تھا۔ اچانک کسی کے پاؤں کی آہٹ سن کر اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا
 کہ مرحوم شبتو کا وہی لڑکا اُس کے پاس کھڑا ہے۔ بندرا بن اٹھ بیٹھا اور
 بولا: ”آؤ بیٹھو شبتو چرن!“

لڑکے کے ہونٹ دو چار دفعہ کچھ بولنے کے لئے پہلے لیکن وہ کچھ بیان
 نہ کر سکا اور ”پہنت جی“ کہہ کر رونے لگا۔

بندرا بن نے اُس یتیم بچے کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس کھینچ لیا۔ اس نے
 روتے ہوئے کہا۔ ”کشن کو بھی تے آرہی ہے۔“

کشن اُس کا چھوٹا بھائی تھا اور وہ بھی کبھی کبھی اپنے بڑے بھائی کے
 ساتھ پانٹھ سالہ میں لکھنے پڑھنے آجایا کرتا تھا۔ آج رات کو ڈاکٹر گوبال داس
 بیس لئے بغیر بندرا بن کے ساتھ کشن کو دیکھنے کے لئے گیا۔ اُس نے
 نبض اور زبان دیکھ کر دوا دی، لیکن کشن نے نہ تو اپنی ماں کی گریہ زاری
 کا خیال کیا اور نہ ڈاکٹر کی طرف ہی دیکھا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی
 وہ گوبال داس کی گرد و لواج میں پھیلی ہوئی حکمت کی شہرت کو بدنامی کا
 دھتہ لگا کر اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا۔

مردہ بیٹے کی نعش کو گود میں لئے بیوہ ماں کی دردناک اور دلدوز آہ وزاری
 سن کر بند رابن کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ اُس سے اُس کی یہ آہ وزاری برداشت نہ ہو سکی
 اور وہ وہاں سے بھاگ کر گھر آ گیا۔ گھر آتے ہی چرن کو اپنی چھاتی سے لگا کر
 رونے لگا۔ اور دل ہی دل میں ایشور کو یاد کر کے کہنے لگا: ”ہے بھگوان!
 انسان کو اُس کے گناہوں کی اور خواہ کوئی بھی سزا دو۔ لیکن یہ ہیبتناک
 سزا کبھی نہ دینا۔“ معلوم نہیں ایشور اُس کی یہ دُعا سنے گا یا نہیں، لیکن آج
 اُس نے اپنے دل میں یہ احساس ضرور کیا کہ یہ زخم اُس کے لئے ناقابلِ شفا
 ہے۔ اور کسی کے دل میں برداشت کی طاقت ہو تو ہو لیکن اُس کے اپنے
 دل میں اتنی طاقت نہیں۔

اس کے بعد دو دن تک کوئی حادثہ وقوع پذیر نہیں ہوا۔ لیکن
 تیسرے دن سنا کہ اُن کے پڑوسی دسک حلوائی کی بیوی بیٹھے سے جاز
 بلب ہے۔

بند رابن کی ماں مزاج پُرسی کے لئے گئی تھی۔ دس بجے کے قریب
 وہ آنسو پونچھتی ہوئی واپس آئی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد رونے پٹنے کی آواز
 سن کر معلوم ہوا کہ دسک حلوائی کی بیوی اپنے چھوٹے چھوٹے چار پانچ
 بچوں کو چھوڑ کر اس دُنیا سے فانی سے کوچ کر گئی ہے۔ اب گاؤں میں
 بیٹھے کی وبا بڑے زور سے پھیلی۔ جن لوگوں کے لئے بھاگنے کی جگہ تھی
 وہ بھاگ گئے۔ لیکن اکثر کے لئے بھاگنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس لئے انہوں
 نے دُرتے دُرتے خشک مٹھ سے کہا: ”جب دانہ پانی ختم ہو جائیگا، تو

اس دُنیا ئے بے ثبات سے کوچ کرنا ہی پڑے گا بھاگنے سے کیا ہوگا؟
 ہندرابن کے مکان کے سامنے سے ہی شمشان کا راستہ تھا وہاں
 سے بار بار رام نام ست کی آواز سے معلوم ہونے لگا کہ اُن میں سے بہت
 سے لوگوں کا دانہ پانی واقعی ختم ہو رہا ہے ۔

اردگرد کے دیہات سے بھی ہر روز دو چار موتوں کی خبر آنے لگی۔ لیکن
 باڈل کی حالت روز بروز زیادہ سے زیادہ خراب ہونے لگی۔ اس کی وجہ یہ
 تھی کہ دیگر باتوں میں اس گاؤں کی حالت اچھی ہونے کے باوجود یہاں
 پینے کے پانی کا اچھا انتظام نہ تھا۔ ندی کوئی نہ تھی اور چوچارتالاب تھے
 وہ بھی کھدائی اور صفائی وغیرہ نہ کرنے اور دوسری باتوں کا خیال نہ رکھنے
 کی وجہ سے خراب ہو گئے تھے، اُن کا پانی بالکل ناقص تھا۔ اور کوئی اس
 کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں کے باشندوں میں سے اکثر کا
 یہی خیال تھا کہ جب تک پانی میں پیاس مٹانے اور کھانا وغیرہ پکانے کی
 طاقت ہے اس وقت تک اُس کے اچھے یا بُرے ہونے کی طرف دھیان دینا
 بالکل فضول ہے ۔

سارے گاؤں میں ڈاکٹر گوہال کے علاوہ اور کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں
 تھا۔ اُسے غریبوں کے گھر جانے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا اور ہیضہ
 روز بروز روبرو بکڑتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی
 کہ علاج معالجہ تو درکنار مردوں کو آگ دینے والے بھی ملنے مشکل ہو گئے۔
 لیکن ہندرابن کا محلہ ابھی تک محفوظ تھا۔ دسک کی بیوی کی وفات کے

بعد ابھی تک یہ پانچ سات گھر محفوظ تھے۔ بندربان کا باپ اپنے استعمال کے لئے جو تالاب کھدوا گیا تھا اُس کا پانی بالکل صاف تھا۔ غالباً اُس کے پڑوسی اُسی پانی کے پینے کی وجہ سے محفوظ تھے۔

لیکن بندربان آہستہ آہستہ فکر سے شوکھنے لگا۔ لڑکے کی طرف دیکھتے ہی اُس کے دل کا خون نیوزی سے حرکت کرنے لگتا۔ بار بار اُس کے دل میں یہی خیال آتا کہ باپ بیٹے کے درمیان ایک ایسی دیوار لمحہ بہ لمحہ حاصل ہوتی جا رہی ہے جو اگرچہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی لیکن ان کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہے۔

اُس میں اب پہلی سی وہ جڑات، وہ حوصلہ اور وہ زندہ دلی نہ رہی تھی۔ بیماری یا موت کا نام سننے ہی اس کی رُوح لرز اُٹھتی۔ اسے کوئی بلانے آتا تو وہ چلا تو ضرور جاتا، لیکن اُس کا ایک ایک قدم اس طرح اٹھنا جیسے پھانسی پر ٹکنے والے مجرم کا پھانسی کے تختہ کی جانب جاتے وقت اٹھنا ہے۔ گویا یہ صرف اس کی دیرینہ عادت ہی تھی جو اُسے بانہ کر اُٹھنے کو کہاں لے جاتی تھی۔ کسی لاش کو جلا کر جب وہ گھر واپس آتا تو چرن کو اپنے پاس بلاتا اور اُس کے جسم کو چھو کر اُس کا بدن کا نہپ اُٹھتا۔ اُسے یہی معلوم ہوتا کہ کسی نامعلوم ذریعے سے کوئی خطرناک بیماری اُس کے اکلوتے بچے کے جسم میں داخل ہو رہی ہے۔ اُسے ہر وقت یہی فکر دماغ گیر رہتی کہ میں کسی نہ کسی طرح اس بچے کو خطرے اور ہیبت ناک موت کے چنگل سے بچا سکوں۔

پاٹھشالہ خود بخود بند ہو گئی تھی۔ چرن کے منہ کی جانب دیکھ کر وہ اس دُکھ کو بھی بھول جاتا تھا۔ اب کچھ دنوں سے اُس نے چرن کے کھلانے پلانے اور کپڑے پہنانے وغیرہ کا سب کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کے متعلق اُسے ماں کا اعتبار بھی نہ رہا تھا۔ انہی دنوں اُس نے ایک دن اپنی ماں کے منہ سے سنا کہ اُن کے پڑوسی تاریکی میں دھبائے کے چھوٹے لڑکے کو میسہ ہو گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر ماں نے کہا: بس بیٹا، اب نہیں۔ تم چرن کو لے کر باہر چلے جاؤ۔“

ہندو ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُس نے جواب دیا: ”ماں تم بھی چلو۔“

ماں نے حیران ہو کر جواب دیا: ”اپنے ٹھاکر جی کو چھوڑ کر؟“
ہندو ماں نے کہا: ”ٹھاکر جی کی پوجا کا کام پر وہ مت جی کے سپرد کر دیجئے۔“

ماں نے اور بھی حیران ہو کر کہا: ”اپنے ٹھاکر جی کی سیوا کا کام دوسروں پر چھوڑ دوں اور آپ بھاگ جاؤں؟“
ہندو ماں نے کچھ شرمناک جواب دیا: ”نہیں ماں، میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تم اپنا فرض اپنے ذمے ہی رہنے دو۔ دو چار دن بعد اگر پھر سراسر انجام دے لینا۔“

ماں نے سر ہلاتے ہوئے استقلال سے جواب دیا: ”نہیں

بیٹا، یہ نہیں ہوگا۔ تمہاری دادی یہ فرض میرے سپرد کر گئی تھی۔ میں بھی اگر کبھی اسی طرح کسی کے سپرد کر سکوں گی، تو کر دوں گی۔ ورنہ یہ میرے ہی ذمے رہے گا۔ لیکن تم لوگ جاؤ۔“

بندرا بن نے جلدی سے جواب دیا — ”بھلا میں تمہیں ایسے وقت جبکہ چاروں طرف آگ دھک رہی ہے تنہا چھوڑ کر کیونکر جاسکتا ہوں؟ مان لو کہ —“

ماں تنہی — ”بیٹا، یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ پھر تو میں سمجھوں گی کہ میرا کام ختم ہو گیا اور بھگوان اپنی پوجا کا کام کسی دوسرے کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ ایشور کرے ایسا ہی ہو۔ میری دُعا لے کر تم لوگ بے فکر ہو کر چلے جاؤ۔ میں اپنے ٹھاکر جی کے پاس بے فکر ہو کر رہ سکوں گی۔ ماں کے بھرائے ہوئے گھٹے سے نکلی ہوئی آواز سے بندرا بن کی کسی دوسری جگہ بھاگ جانے کی خواہش ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا — ”تو پھر میں بھی کہیں نہ جاؤں گا۔ اگر تمہارا ٹھاکر جی ہے تو میری بھی ماں ہے۔ مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں۔ صرف چرن کو دیکھ کر ہی اس جگہ رہنے سے دل گھبراتا ہے۔ لیکن یہاں سے کسی طرح ہم جا ہی نہیں سکتے، تو آج سے میں اُسے ٹھاکر جی کی پناہ میں سوئپ کر بے فکر اور بے خوف ہو کر رہوں گا۔ آج کے بعد تم کبھی میرا چہرہ مڑھایا ہوا نہ پاؤ گی۔“

تاری کا چھوٹا لڑکا مر گیا۔ دوسرے دن صبح بندرا بن کسی کام کیلئے

باہر جا رہا تھا۔ دیکھا کہ اُن کے تالاب کے گھاٹ پر ہی کوئی عورت کپڑے دھو رہی ہے۔ کچھ دھوئے جا چکے ہیں، اور کچھ ابھی دھونے باقی ہیں۔ اُن کپڑوں کی شکل دیکھتے ہی بندرا بن کی رُوح لوز اُٹھی۔ نزدیکی پہنچ کر غصے سے بولا۔ ”مُردے کے کپڑے یہاں کیوں دھو رہی ہو؟“ اُس عورت نے گھونگھٹ کی آڑ سے نہ معلوم کیا جواب دیا۔ اس کا ایک لفظ بھی بندرا بن کی سمجھ میں نہ آیا۔

بندرا بن نے پھر کہا۔ ”جو ظلم کریں گی، اُس کا تو کوئی علاج نہیں لیکن اب باقی کپڑے یہاں نہ دھوؤ ورنہ چلی جاؤ۔“ وہ عورت دھوئے اور بنا دھوئے کپڑے اُٹھا کر وہاں سے چلی گئی۔

بندرا بن تھوڑی دیر تالاب کے پانی کی طرف خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد جب وہ وہاں سے چلنے لگا تو اُس نے دیکھا کہ تاری جلدی جلدی اُسی طرف آ رہا ہے۔ ایک تو وہ ویسے ہی بیٹے کے غم میں پاگل ہو رہا تھا، دوسری اُمیر سے یہ بے عزتی ہوئی۔ اس نے اس کو بالکل ہی بدحواس کر دیا۔ ”وہ آتے ہی پاگلوں کی مانند منہ اور آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”متم نے میری بیوی کو نہانے نہیں دیا؟“ بندرا بن نے جواب دیا۔ ”نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں نے گندے کپڑے دھونے سے ضرور منع کیا ہے۔“

تاری نے چلا کر کہا۔ ”تو اُنہیں اور کہاں دھونے جائیں؟“

رہیں باڈل میں اور کپڑے دھونے جائیں وٹید جاتی ہیں؟ بندرا بن اُٹم
برباد ہو جاؤ گے شو در ہو کر روپے کی طاقت سے براہمن کو دُکھ دو گے
تو بیڑہ غرق ہو جائیگا؟

بندرا بن کا دل دہل اُٹھا۔ لیکن فضول بحث مباحثہ کرنے کی اُس
کی عادت نہ تھی۔ اس لئے اُس نے اپنے آپ کو سنبھال کر سنجیدگی سے
جواب دیا۔ اگر میں اکیلا تنہا ہو جاؤں تو کوئی پیر و انہیں، لیکن آپ تو
سارے محلے کو بہرا کر رہے ہیں۔ سارا گاؤں اُجڑا جا رہا ہے۔ صرف
یہ محلہ محفوظ ہے، کیا تم اسے بھی محفوظ نہ رہنے دو گے؟

تارنی نے جوش میں آکر کہا۔۔۔ لوگ ہمیشہ سے اس تالاب میں
کپڑے نہیں دھوتے تو کیا تمہارے سر پہرہ دھویا کرتے ہیں بھتیہ؟
بندرا بن نے استقلال سے جواب دیا۔ یہ تالاب میرا ہے، اگر آپ
میری اس بات کو نہ مانیں گے، تو آپ کے گھر کے کسی آدمی کو میں
تالاب میں نہ اُترنے دوں گا؟

”اُترنے نہ دو گے تو پھر بتاؤ، ہم کہاں جائیں گے؟“

بندرا بن نے جواب دیا۔۔۔ ”یہاں سے صرف پینے اور استعمال
کے لئے پانی لے جا سکو گے۔ اگر کپڑے دھونے ہوں، تو گاؤں سے
باہر والے جو ہڑ میں جا کر دھونے پڑیں گے؟“

تارنی نے منہ بنا کر کہا ”شو در ہو کر تیرا اتنا بڑا منہ؟ کہتا ہے
کہ عورتیں باہر جا کر کپڑے دھویا کریں۔ ارے صرف ہمارے ہی گھر پڑے

مصیبت نہیں آئی، تیرے گھر پر بھی آئیگی۔“

بندرا بن نے اُسی طرح سنجیدگی اور نرمی سے جواب دیا —
 ”میرا مطلب عورتوں کو گاؤں سے باہر جا کر کپڑے دھونے کے لئے
 سمنے کا نہیں تھا۔ اگر آپ کے گھر کوئی نوکر یا نوکرانی نہیں تو آپ بھی تو مرد
 ہیں، آپ ہی باہر جا کر دھولا یا کریں۔ آپ اس دقت رنج اور غم سے
 بے چین ہو رہے ہیں، اس لئے آپ کو میں کوئی مسخت لفظ نہیں کہنا
 چاہتا۔ لیکن آپ کے لاکھوں بددعا میں دینے کے باوجود میں آپ کو
 یہاں گندے کپڑے دھو کر پانی خراب نہ کرنے دوں گا۔“ یہ کہہ کر بندرا بن
 بغیر کوئی مزید بات کئے اپنے گھر چلا گیا۔

قریباً دس منٹ بعد گھوٹال محلہ کے دروازے پر آکر پکارنا
 شروع کیا۔ وہ تاری کارشتہ دار تھا۔ بندرا بن کے باہر آتے ہی
 بولا ”بھائی بندرا بن! سب لوگ تو ہمیں بڑا اچھا لڑکا سمجھتے تھے پھر
 یہ تمہارا نیا طرز عمل کیسا ہے۔ ایک تو براہمن پہلے ہی بیٹے کے غم
 میں باگل ہو رہا ہے، اُس پر تم نے اُس کا تالاب پر جانا بند کر دیا!“
 ”صرف گندے کپڑے دھونے سے روکا ہے۔ پانی لے جانے
 سے نہیں۔“

گھوٹال نے کہا ”یہ اچھا نہیں کیا بھتی۔ اچھائیں کہہ دیتا ہوں۔
 وہ تمہاری بات مان لیگا اور گھاٹ کی بجائے دُور بہٹ کر دھولیا
 کرے گا۔“

بندرا بن نے جواب دیا: "سارا گاؤں صرف اسی تالاب کا پانی پیتا ہے۔ اس مصیبت کے وقت میں کسی طرح بھی اس کا پانی خراب نہ ہونے دینگا۔"

گھوٹال ماشے نے ناراض ہو کر کہا: "بندرا بن! تمہاری یہ ضد ٹھیک نہیں۔ جس کو میں یا تالاب کی وید منستروں اور شاستروں کی مراد پوری کرنے کے بعد کھدوائی ہوئی ہو، اُس کا پانی کسی طرح گندہ یا خراب نہیں ہو سکتا۔ انگریزی کے چار حرف بڑھ کر تم شاستروں پر یقین نہیں رکھتے؟ بھلا اس طرح کیسے کام چلے گا؟"

بندرا بن ایک ہی بات کو بار بار دہرا کر تھک گیا تھا۔ غصے میں بھر کر لولا: "میں شاستروں میں ضرور یقین رکھتا ہوں، لیکن آپ کے من گھڑت شاستروں کو نہیں ماننا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، وہی ہو گا۔ میں گندے کپڑے نہیں دھونے دینگا۔ اگر اور کوئی ہوتا تو مرحوم کے کپڑے اُس کے ساتھ ہی جلا دیتا۔ لیکن اگر آپ لوگ اُن کا لالچ نہیں چھوڑ سکتے، تو انہیں باہر والے جھڑ میں دھولاؤں۔ میرے تالاب میں آپ انہیں نہیں دھو سکتے۔" یہ کہہ کر بندرا بن اندر چلا گیا۔ ویدوں اور شاستروں کے ٹھیکیدار گھوٹال ماشے بھی اُسے بددعا میں دیتے اپنے گھر چلے گئے۔

لیکن بندرا بن ابھی طرح جانتا تھا کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہونے والا نہیں۔ اس لئے اُس نے ایک آدمی تالاب پر پرہ دینے کے لئے

بھیج دیا۔ اُس نے تمام دن کے بعد رات کو نو بجے آ کر خبر دی کہ تالاب میں کپڑے دھوئے جا رہے ہیں، اور تارنی کسی طرح نہیں مانتا۔ بند راہن نے فوراً وہاں پہنچ کر دیکھا کہ تارنی کی پیوہ لڑکی وہاں تکیے کے خلاف، پھولنے کی چادریں اور پھولنے بڑے بہت سے گندے چیتھرے تالاب میں دھو رہی ہے اور دھو دھو کر اُسی میں بچھڑ رہی ہے۔ تارنی خود وہاں کھڑا ہے :



بارھواں باب

دوسرے دن بندرا بن نے اپنی ماں کے کہنے کے مطابق چرن کو پاس بلا کر پوچھا۔ ”کیوں بیٹا، اپنی ماں کے پاس جاؤ گے؟“
چرن یہ سن کر خوشی سے ناچنے لگا، اور بولا۔ ”ہاں بابو جی، جاؤنگا۔“

بندرا بن دل ہی دل میں چوٹ سی محسوس کر کے بولا۔ ”لیکن وہاں تمہیں بہت دن رہنا پڑے گا۔ ہمیں چھوڑ کر وہاں رہ سکو گے؟“
چرن نے جلدی سے سر ہلا کر جواب دیا۔ ”ہاں، رہ سکونگا۔“
درحقیقت آئے دن کی سخت پابندیوں کے مارے اور کڑی نگاہ رکھی جانے کی وجہ سے اس بچے کی نٹھکی سی جان تنگ آ گئی تھی۔ وہ باہر کھیل کود نہ سکتا تھا۔ پانچ سالہ بندھتی، شکی ساتھیوں کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا اور عمو ماؤں رات گھر کے اندر ہی بند رہنا پڑتا تھا۔ چاروں طرف میبت سی طاری تھی۔ اگرچہ وہ کوئی بات اچھی طرح نہیں سمجھتا

تھا۔ پھر بھی وہ دل ہی دل میں بہت بے چین رہتا تھا۔ اور ادھر ماں کی بے پناہ محبت، ہر قسم کی آزادی، نہانا۔ کھیلنا کودنا اور کھانا پینا، کسی بات کی کوئی ممانعت نہ تھی۔ ہزار قصور کرنے پر بھی ہنستی ہوئی محبت بھری گھر کی ملتی تھی۔ اور بس کسی کی بھی ٹیڑھی آنکھ نہ دیکھنی پڑتی تھی۔ وہ وہاں جانے کے لئے بے چین ہوا اٹھا۔ بند راہن نے کہا: اچھا، تو پھر جاؤ، اور اپنے ہاتھ سے ٹین کے ایک بکس میں اُس کے پہننے کے کپڑے بھر کر اور اُس میں کچھ روپے بھی رکھ کر اُسے گاڑی میں بٹھا دیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے اکلوتے بچے کا منہ چومتے ہوئے اُس کی ماں کے پاس بھیج دیا۔ اگرچہ بچے کی جدائی اسے شاق گزور رہی تھی لیکن اس خیال سے اُس نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب وہ موت کے ہیتناک جبرٹوں سے رہائی پا جائیگا۔ جو نو کرچرن کے ساتھ گیا، اُسے اس کی مکمل نگہداشت رکھنے کی ہدایت کر دی گئی اور یہ تاکید بھی کی گئی کہ اگر ہر روز نہیں تو دوسرے تیسرے دن اُس کی خیر و عافیت کی خبر وہ ضرور دیتا رہے۔ روانگی کے وقت بند راہن نے دل ہی دل میں کہا: خواہ لڑکا پھر دیکھنے کو نہ ملے، لیکن اس دھکتی ہوئی آگ میں تو میں اسے نہیں رکھ سکتا۔

جب تک گاڑی دکھائی دیتی رہی بند راہن ٹمکشی لگائے دیکھتا رہا۔ پھر گھر کے اندر آکر کچھ دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد اچانک اسے اُس دن کا واقعہ یاد آگیا اور وہ اس خیال سے لرز گیا کہ کہیں بعد میں

کُسم ناراض نہ ہو گئی ہو۔ پھر دل ہی دل میں کہا: ”نہیں، یہ کام ٹھیک نہیں ہوا۔ اتنے ضدی انسان کا کیا ٹھکانہ ہے۔ میں ساتھ نہیں گیا، اس سے کہیں کچھ اور سمجھ کر آگ بگولہ نہ ہو جائے۔“ وہ فوراً گندھے پر ایک چادر رکھ کر تیز چلتا گاڑی کے پاس جا پہنچا اور اُس پر سوار ہو کر چرن کے پاس بیٹھ گیا۔

کنج ناتھ کے مکان کے سامنے پہنچ کر باہر ہی سے گھر کی حالت دیکھ کر بندہ بن حیران رہ گیا۔ چاروں طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مکان بہت دنوں سے غیر آباد پڑا ہو۔ دروازہ کھلا تھا، چرن کو ساتھ لے کر اندر داخل ہو کر دیکھا، تو وہاں بھی وہی حالت تھی۔

آہٹ پا کر کُسم بھی اندر سے بیٹھا کہتی ہوئی باہر نکل آئی۔ لیکن اُن کو دیکھ کر وہ افسوس اور تکبر کے مارے جل اُٹھی۔ اور لمحہ بھر میں پھر اپنی کوٹھڑی کے اندر چلی گئی۔ چرن پہلے کی مانند خوشی سے جلاتا ہوا دوڑ کر گیا اور کُسم کے ساتھ چمٹ گیا۔ کُسم چرن کو گود میں اٹھا کر اور سر کا آچھل ٹھیک کر کے پانچ منٹ بعد دروازے کی چوکھٹ میں آکر کھڑی ہو گئی۔

بندہ بن نے پوچھا — ”کنج بھتیا کہاں رہے؟“
 ”معلوم نہیں — کہیں گھومنے گیا ہے۔“

بندہ بن نے کہا: ”مکان کی حالت دیکھنے سے تو ایسا معلوم ہوتا

ہے جیسے بہت دنوں سے یہ مکان غیر آباد پڑا ہو۔ کیا بہت دنوں سے تم لوگ یہاں نہیں تھے؟“

”نہیں“

”کہاں تھے؟“

قریباً ایک مہینہ ہوا کہ تم اپنے بھائی کی ساس کے ساتھ مغرب کی جانب تیرتے یا ترا کر نے چلی گئی تھی۔ ابھی کل ہی شام کو وہ کوٹ کر آئی تھی۔ لیکن سچ بات نہ کہہ کر اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”یہاں، وہاں، کئی جگہ“

پہلے جب کبھی بندرا بن آتا تھا تو کسٹم بیٹھنے کے لئے فوراً آسن بچھا دیتی تھی۔ لیکن آج اُس نے آسن دینا تو درکنار بیٹھنے کے لئے کہا تک بھی نہیں۔ یہ دیکھ کر بندرا بن نے خود ہی کہا ”میں کھڑا ہوں، بیٹھنے کے لئے جگہ تو دو“

کسٹم نے اسی طرح بے رنجی سے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں آسن باسن کہاں پڑا ہے“ اور یہ کہہ کر وہ اُسی جگہ کھڑی رہی، ایک قدم بھی نہ ہلی۔

بندرا بن بہت متحمل مزاج تھا۔ پھر بھی اس بے عزتی سے اُس کے دل کو سخت چوٹ پہنچی۔ لیکن اُس دن جوش میں آکر جھگڑا کرنے کا قابل نفرت فعل اُسے یاد تھا۔ اس لئے کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بڑی نرمی سے بولا۔ ”میں تمہیں زیادہ دیر تک تکلیف نہیں دینگا۔“

میں جس کام سے آیا ہوں وہ بتا دیتا ہوں۔ ہمارے گاؤں میں بیماری کا بڑا زور ہے۔ اس لئے میں آج چرن کو تمہارے پاس چھوڑ جاؤنگا۔
 کسٹم چونکہ بہت دنوں سے یہاں نہیں تھی اس لئے وہ بیمار ہی مغیرہ
 کا مطلب نہ سمجھی۔ اُس نے جوش اور خود داری سے جواب دیا یہ اوہ،
 اسی لئے مہربانی کر کے یہاں لے آئے ہو، لیکن بیماری کہاں نہیں ہے؟
 اور میں کس حوصلے پر پرانے لڑکے کی ذمہ داری اپنے سر لے لوں؟
 بند رابن نے سنجیدگی سے جواب دیا جس حوصلے پر میں لے آیا
 ہوں، اُسی حوصلے پر۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ وہ سب سے
 زیادہ تم سے ہی محبت کرتا ہے۔“

کسٹم کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ چرن اپنے ہاتھ سے اُس کا منہ اپنی
 طرف کھینچ کر کہا: ”ماں، بابو جی کہتے ہیں کہ تمہارے پاس رہوں گا۔
 نہانے چلو گی نا؟“

اس کے جواب میں کسٹم نے بند رابن کو سناتے ہوئے کہا —
 ”نہیں میرے پاس رہنے کی ضرورت نہیں، تمہاری نئی ماں آئے گی تو
 اُس کے پاس رہنا۔“

بند رابن نے ہچکی ہنسی ہنس کر جواب دیا — ”یہ خبر بھی
 سن لی۔ اچھا تو میں بتائے دیتا ہوں۔ ماں اکیلی گھر نہیں سمجھا سکتی
 اسی لئے ایک دفعہ وہ بات اٹھی تھی۔ لیکن اُسی وقت بند ہو گئی؟
 ”کیوں بند ہو گئی؟“

”اس کی ایک خاص وجہ ہے لیکن اُن سب باتوں سے کیا فائدہ!
 آؤ بیٹا چرن! چلو اپنے گھر چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔“
 چرن نے خوشامد نہ سمجھ میں جواب دیا: ”بابو جی کل آؤنگا؟“
 بند رابن خاموش ہو گیا۔ کُسم نے بھی بغیر کوئی جواب دیئے
 چرن کو گویا سہ اُتار دیا۔ اس کے دس منٹ بعد بند رابن نے بڑی
 سنجیدگی سے کہا: ”آؤ دیر نہ کرو بیٹا، چلو“ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ
 قدم رکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

چرن نے لاڈ پیار کی فضا میں پرورش پالے پر بھی بڑوں کا ادب
 کرنا سیکھا تھا۔ پہلے تو اُس نے ایک بار محبت بھری نظروں سے ماں
 کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر کچھ اُداس ہو کر چپ چاپ باپ کے پیچھے
 پیچھے باہر آ گیا۔

گاڑی بان بیلوں کو ندی پر پانی پلانے گیا تھا۔ باپ بیٹا سڑک
 پر کھڑے ہو کر اُس کی انتظار کر لے گئے۔
 اب کُسم وہاں سے کھسک کر صدر دروازے کی آڑ میں سے
 اپنے خاوند کا منہ دیکھ کر چونک پڑی۔

اب اُس میں وہ نور نہ تھا، آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، اور
 چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو سمجھال کر دروازے کی
 آڑ میں سے پکار کر کہا: ”ذرا ایک بات سن جاؤ؟“
 بند رابن نے نزدیک آ کر پوچھا: ”کیا کہتی ہو؟“

”کیا اس دوران میں بیمار تھے؟“

”نہیں“

”تو پھر مریض سے کیوں دکھائی دیتے ہو؟“

”یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ شاید زیادہ فکر کی وجہ سے دُلا دکھائی

دیتا ہوں۔“

”فکر اور تردد! خاوند کے اُترے ہوئے چہرے کی جانب دیکھ کر

اُس کا جوش کچھ کم ہو گیا تھا۔ لیکن آخری بات سن کر وہ پھر بھڑک اُٹھی۔

اُس نے طنز آمیز لہجہ میں کہا — ”آپ تو ہر طرح سے سُکھی ہیں۔

فکر اور تردد کس بات کا، ذرا میں بھی تو سُٹوں؟“

بند راہن نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی تیار

ہو جانے پر چرن اُس پر سوار ہونے لگا۔

بند راہن نے کہا — ”کیوں رے اپنی ماں کو پر نام نہیں کر آیا؟“

چرن نے گاڑی سے اُتر کر اور دروازے کے باہر زمین بوس

ہو کر ماں کو پر نام کیا۔ لیکن جب کُسم نے ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑنا چاہا،

تو وہ بھاگ گیا۔ سب باتیں نہ سمجھنے کے باوجود بھی وہ یہ ضرور سمجھ

گیا کہ ماں نے آج میری آؤ بھگت اور توقیر نہیں کی۔ وہ رہنے

کے لئے آیا تھا، لیکن ماں نے اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا

تھا۔ بند راہن نے اور بھی نزدیک آ کر کہا — ”کون جانے پھر

کبھی کہہ سکوں گا یا نہیں، اس لئے آج کہے جاتا ہوں۔ آج تو تم نے

غصے کی حالت میں اپنے چرن کو جگہ نہیں دی، لیکن میرے نہ رہنے پر اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرنا۔“

کسٹم بے چین ہو کر درمیان میں ہی ٹوک کر بولی۔ ”یہ باتیں سننا نہیں چاہتی۔“

”پھر بھی سن لو۔ آج میں اسے تمہیں سوپ دینے کے لئے ہی آیا تھا۔“

”تمہیں میرا اعتبار ہی کیا ہے۔“

بند رابن کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اُس نے کہا۔ ”پھر وہی راضگی کی بات! کسٹم سنا ہے کہ تم نے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن عورتوں کے لئے سب سے بڑی سیکھنے کی بات ہے، معاف کرنا، وہ تم نے کیوں نہیں سیکھا؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم چرن کی ماں ہو۔ لڑکے کو سوچنے کے لئے اگر ماں باپ کا اعتبار نہ کیا جائے تو پھر اور کس کا کیا جائے؟“

کسٹم کو اس کا کوئی جواب نہ سوجھا۔

بیل گھر جانے کے لئے اُچھل کود کر رہے تھے۔ چرن نے پکارا۔ ”بابو جی! آؤ نا، کسٹم کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔ لیکن اس سے پہلے

ہی بند رابن ”اچھا چلو“ کہہ کر گاڑی پر جا بیٹھا۔

کسٹم وہیں بیٹھ گئی۔ اور اپنی آنجنائی ماں کو یاد کر کے کہنے لگی۔ ”ماں! تم ماں ہو کر بھی میرے ساتھ کتنی ناقابل برداشت دشمنی

کر گئی ہو اگر واقعی تم میری ناواقفیت میں میری پیشانی پر کانک کا ٹیکا لگا گئی ہو اور اگر واقعی اپنی نفرت انگریز بدنامی کی قربان گاہ پر مجھے قربان کر گئی ہو، تو مجھ سے یہ بات صاف صاف کیوں نہ کہی! کس کے خوف سے وہ تمام نشان اس طرح مٹا گئیں! میرا دل اپنے خاوند اور بیٹے کو پہچان گیا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ اپنے رشتے کو دنیا کے سامنے ثابت کرنے کا تم کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑ گئیں۔ اگر ایسا ہوتا، تو آج کون مجھے چھوڑ سکتا تھا! کون بے شرم خاوند اپنی بیوی کو تہیوں اور محتاجوں کی مانند اپنے زیر سایہ آنے کا مشورہ دینے کا حوصلہ کرتا! لیکن اگر یہ غلط ہے اور میں واقعی بیوہ ہوں، تو یہ میں ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں جان سکتی۔ اُس حالت میں کس کی مجال تھی جو ایک بیوہ کے سامنے اُس کے حُسن پر فریفتہ ہو کر ودھوا بواہ کی بات چھیڑنے کی جرات کرتا!

”کسٹم اُسی جگہ بیٹھی بہت دیر تک روتی رہی۔ پھر آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی ہاتھ جوڑ کر بولی ”بھگوان میری مدد کرو۔ یا تو مجھے خود داری سے سسر اُٹھا کر بتی کے گھر جانے دو اور یا بچپن کے وہی بے ٹکری اور اطمینان کے ایام پھر لا دو۔ تاکہ میں مسکھ کی سانس لے سکوں۔“

تیرھواں باب

اُس دن جب کُشم نے اپنے بھائی سے سنا کہ اُس کا بھتی دوسری شادی کر رہا ہے، تو وہ متفکر ہو کر سوچنے لگی کہ میں کہاں بھاگ جاؤں اور کیا کروں؟ اتنے میں اُس کے بھائی کی ساس تیرھہ باترکے لئے تیار ہوئی۔ جب اس نے کُشم سے کہا، تو وہ بھی کسی پس و پیش کے بغیر اُس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ کنج کی ساس کُشم کو اپنے ساتھ داسی بنا کر لے گئی تھی۔ اور دورانِ سفر میں اُس کے ساتھ ویسا ہی سلوک بھی کیا۔ لیکن کُشم میں چھوٹی مموئی باتوں پر دھیان دینے کی طاقت ہی نہ تھی۔ اس کے بعد جب وہ واپس نل ڈوانگلے آئی اور وہاں سے اپنے گھر جانے کے لئے تیار ہوئی، تو کنج کی ساس نے سانپ کی مانند چھنکار کر کہا: ”نہ بھائی، پاگلوں کی سی باتیں نہ کرو، ہم لوگ ٹھیرے بڑے آدمی، اس لئے قدم قدم پر ہمارے دشمن ہیں۔ اور تم ٹھیریں جو ان عورت، اگر تم وہاں تنہا پڑی رہو گی۔ تو

ہم لوگ سماج میں مُنہ نہ دکھا سکیں گے، کسٹم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا،

تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر کہا: اگر دل کرے تو اپنے بھائی کے ساتھ چلی جاؤ، اور گھر بار دیکھ کر پھر اُس کے ساتھ ہی آ جانا۔ میں کہے دیتی ہوں، کہ تم وہاں اکیلی کسی طرح نہیں رہ سکتیں، کسٹم اس حکم کو مان کر کل شام اپنا گھر بار دیکھنے آئی تھی، آج چترن وغیرہ کے چلے جانے کے قریباً دو گھنٹے بعد کُنچ ناٹھ زمینداروں کی رفتار سے سارے گاؤں میں گھوم پھر کر واپس آیا۔ نہا کر کھانا کھایا اور پھر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اپنی بہن کو ساتھ لے کر سُسرال جانے کی تیاری کرنے لگا۔

کسٹم گھر میں تالا لگا کر چپ چاپ گاڑی پر جا بیٹھی۔ وہ جانتی تھی کہ بھائی اُن لوگوں سے ناراض ہے، اس لئے اُس نے صبح کے واقعہ کا اُس سے بالکل ذکر نہ کیا۔

کُنچ کی بیوی کا نام برجیشوری تھا۔ وہ جیسی صورت سے سیاہ رنگ کی تھی ویسی ہی سیرت سے بھی لڑاکی تھی۔ اس کی عمر اگرچہ ابھی پندرہ برس کی بھی نہیں تھی لیکن اُس کے طرز گفتگو اور غصے کی آگ سے اُس کی ماں کو بھی بارہا پناہ مانگنی پڑتی تھی۔ لیکن کسٹم کو دیکھتے ہی نامعلوم اسے کیا ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کی طرح محبت کرنے لگی۔ یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ برجیشوری کی ماں اس کے

اس روپے سے خوش نہیں ہوئی۔ اور بیٹی کی آنکھ بچا کر کسٹم کو چلی گئی

گھر کے سامنے ہی ایک تالاب تھا۔ تین چار دن بعد ایک دن صبح کسٹم کچھ برتن دھونے کے لئے جا رہی تھی۔ برجیشوری نے اندر سے نکل کر اُونچی آواز سے پوچھا — ”کیوں نند جی، ماں تمہیں کتنے روپے ماہوار پر نوکر رکھ کر لاتی ہے؟“

ماں نزدیک ہی بھنڈار کے پاس بیٹھ کر کام کر رہی تھی۔ لڑکی کی کانوں کو چھاڑنے والی آواز سن کر غصے میں بھر کر بولی — ”یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے اپنے آدمی کو بھی کوئی تنخواہ مقرر کر کے گھراتا ہے؟“ برجیشوری نے جواب دیا — ”اگر اپنی بیٹے تو میری بیٹے، تمہاری کون ہے جو تم اُس غریب سے داسیوں کی مانند کام لوگی اور تنخواہ نہ دوگی؟“

اس کے جواب میں ماں نے جلدی سے جا کر کسٹم کے ہاتھ سے سب برتن چھین لئے اور اُن کو لے کر تالاب کو چل دی۔ کسٹم پاگلوں کی مانند چپ چاپ کھڑی رہی۔ برجیشوری اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی — ”اچھی بات کہتے جانے دو!“

اس کے بعد دو تین دن برجیشوری کی ماں نے کسٹم کی طرف اشارے کر کے خوب زہر اُگلا۔ لیکن اچانک ایک دن اُس کے

طرز عمل میں تبدیلی دیکھ کر برہیشوری حیران رہ گئی۔
اُس رات طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے کُسم نے کھانا
نہیں کھایا تھا۔ صبح ہنس کُنج کی ساس اسے بار بار کہنے لگی کہ نہادھو کر اور
پُوجا پاٹھ کر کے کھانا کھالو۔

برہیشوری نے نزدیک جا کر آہستہ سے کہا — ”نندھی،
میں سوچ رہی ہوں کہ ماں نے آج اپنا رویہ یکایک بدل کیوں دیا
ہے؟“

کُسم خاموش رہی۔ لیکن برہیشوری اپنی ماں کو خوب پہچانتی تھی۔
اس لئے دو ہی دن میں اس نے تبدیلی کے اسباب معلوم کر لئے اور
اس علم سے اس کے دل کو بڑی تکلیف پہنچی۔ اُس کی ماں کا ایک بھانجا
تھا — گوردھن۔ اندھا دھند ٹاڑی اور گاجپانی کر اُس نے اپنی
شکل ایسی بگاڑ لی تھی کہ کوئی یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کی عمر پینیس
سال ہے یا پینسٹھ سال۔ کوئی اُس سے اپنی لڑکی دینا پسند نہ کرتا تھا۔
اس لئے وہ ابھی تک مجر د ہی تھا۔ پہلے تو وہ شاید ہی کبھی ملتا تھا،
لیکن آجکل کوئی نہ معلوم کُشش اُسے ہر روز خالہ کے گھر کھینچ لاتی
تھی۔ اور خالہ کی محبت اور عقیدت بھی اب اس کے دل میں اتنی پیدا ہو گئی
تھی کہ وہ اُس کے پاس دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا۔ اور اس کے
محکم احکام بھی ماننے لگا تھا۔

آج دوپہر کو برہیشوری کُسم کو ساتھ لے کر تالاب میں نہانے

گئی تھی۔ پانی میں اُترنے پر اُس کی نگاہ اچانک گھاٹ کے پاس ہی کامنی کے گھنے درخت کی طرف گئی۔ اُس نے دیکھا کہ گوردھن اُس کی آڑ میں کھڑا ہو کر مکئی لگائے ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ لیکن اُس وقت وہ خاموش رہی نہادھو کر گھر آئی، تو دیکھا کہ وہ آنگن میں کھڑا ہوا اپنی خالہ سے باتیں کر رہا ہے۔ کسم جلدی سے گھونگھٹ محال کر اُس کے سامنے سے کترائی ہوئی اندر چلی گئی۔ برجیشوری نے نزدیک جا کر پوچھا: کیوں گوردھن بھیا! پہلے تو کبھی نظر نہ آتے تھے۔ آج کل تم اتنے مہربان کیسے ہو گئے؟ اب تم گھر کے اندر آنا جانا ذرا کم کر دو؟

گوردھن کو معلوم نہ تھا کہ برجیشوری نے اُس کو کامنی کے درخت کی آڑ میں کھڑے دیکھ لیا ہے۔ برجیشوری کے اس سوال اور اُس کے رویہ کو دیکھ کر وہ شپٹا گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

لیکن برجیشوری کی ماں آگ بولہ ہو کر، آنکھیں سرخ کر کے، چلا اٹھی۔ پہلے اُس کا دل نہیں کرتا تھا نہیں آتا تھا۔ اب اُس کا دل کرتا ہے اس لئے آنا ہے۔ تو کیوں بگڑتی ہے؟

برجیشوری نے غصہ نہیں کیا، سنجیدگی سے جواب دیا: ”یہ خواہش مجھے پسند نہیں ماں! میں اپنے لئے اتنا نہیں کہتی، میری ننھی یہاں ہے۔ کم سے کم اس بات کا خیال تو رکھنا چاہیے کہ وہ پرانی لڑکی ہے“

ماں نے گلا پھاڑ کر جواب دیا: ”تو کیا پرانی لڑکی کے لئے، ہم اپنے رشتہ داروں کو بھی چھوڑ دیں، اُن کے لئے اپنے گھر کے

دروازے بند کر لیں۔ پھر یہ پرانی لڑکی کیا پردہ نشین ہے، جو کسی کے سامنے نہیں نکلتی؟ وہ تو سب کے سامنے اس طرح باہر نکلنا جانتی ہے کہ اُسے دیکھ کر میرے جیسی بوڑھیوں کو بھی شرم آتی ہے۔“

برجیشوری نے سمجھ لیا کہ ماں کا اشارہ کس طرف ہے۔ اس لئے وہ کچھ رُک گئی۔ اُسے یاد آ گیا کہ اسی کُسم کے متعلق چند دن پہلے اُس نے خود بھی اپنی ماں سے کتنی ہی ایسی ویسی باتیں کہی تھیں لیکن اُس وقت کی بات کچھ اور تھی، اب کچھ اور ہو گئی تھی۔ اُس وقت اُسے کُسم سے محبت نہیں تھی، اب محبت ہو گئی تھی۔ حقیقتی بہنوں سے بھی زیادہ محبت۔ اس قسم کی محبت ایک انسان دوسرے سے بھگلیان کی کرپا کے بغیر کر ہی نہیں سکتا۔

برجیشوری جلنے لگی لیکن جاتے جاتے گور دھن کی طرف کڑی نظروں سے دیکھ کر لولی۔ ”بھتیہ بڑی بے حیائی کی بات ہے میں مُنہ کھول کر کہہ تو نہیں سکتی، لیکن دیکھ سب کچھ لیا ہے۔ اگر بھائی کی طرح یہاں آسکو تو بخوشی آیا کرو۔ ورنہ تمہاری تقدیر میں دُکھ کھا رہے اور اُس دُکھ سے تمہیں تمہاری خالہ بھی نجات نہیں دلا سکتی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔“

گور دھن نے آنکھیں لال کر کے کہا۔ ”خالہ! میں تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں، میں نہیں جانتا کہ کون سا لادیاں جھاڑی کے اندر دھن توڑنے، میں۔“ پوچھنے کے لئے۔ چلو نالوائی کی دکان

پر۔ آئے وہ میرے ساتھ اُس محلے میں، ثابت کر دیتا ہوں“ اسی قسم کی بے معنی باتیں کرتا ہوا گوردھن وہاں سے کھسک گیا۔
 برجیشوری نے کپڑے بدل کر کسٹم کی کوٹھڑی میں جا کر دیکھا کہ وہ ابھی تک بھگی دھوتی پہنے ہوئے جھٹلے کے سہارے کھڑی باہر کی جانب دیکھ رہی ہے۔ پاؤں کی آہٹ سن کر اُس نے روتے ہوئے کہا: ”کیوں بھابی، تم کیوں خواہ مخواہ میرے لئے جھگڑا مول لیتی ہو۔ کیا تم مجھے یہاں بھی نہ رہنے دو گی؟“

”پہلے تم یہ دھوتی اتارو، پھر بتاؤں گی۔“
 یہ کہہ کر برجیشوری نے زبردستی اُس کی بھگی دھوتی اُتر وا کر دوسری دھوتی پہنوائی۔ اس کے بعد کہا: ”نند بہن، مجھ سے کسی پر ظلم ہوتے دیکھا نہیں جاتا۔ وہ خواہ تم پر ہو خواہ کسی اور پر نہیں تو اُس کجوت کو اب گھر میں نہ گھسنے دو نکلی۔ میں اُس کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔“ وہ شرم کے مارے ماں کے دل کی بات نہ کہہ سکی۔
 کسٹم نے رونی صورت بنا کر کہا: ”مطلب کسی کا کچھ ہو، لیکن بھابی، میں تمہارے پاؤں پکڑتی ہوں، تم میرے لئے اپنی ماں سے لڑ کر مجھے اور زیادہ مصیبت میں نہ پھنساؤ۔“

”لیکن میری زندگی میں تم پر مصیبت آ ہی کیونکر سکتی ہے؟“
 کسٹم نے سر ہلا کر جواب دیا: ”ضرور آئیگی۔ آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ وہ آئیگی ریشیانی پر ماتھ مار کر اپنی اس بے نصیبی کو لے کر

جہاں بھی جاؤنگی وہیں مصیبت بھی ساتھ جائیگی۔ شاید بھگوان نے بھی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ برجیشوری نے اُس کے آنسو پونچھ ڈالے اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد آہستہ سے کہا۔۔۔ شاید تمہاری بات بالکل غلط نہیں ہے لیکن تم ناراض نہ ہونا بہن۔ صرف تقدیر کو کوسنے سے ہی گزارہ نہیں ہوگا! اس میں تمہارا اپنا قصور بھی کچھ کم نہیں!

کسم نے برجیشوری کے منہ طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔۔
”بھلا میرا کیا قصور ہے؟ میری بچپن کی ساری بات تو تم نے سُنی ہی ہوگی؟“

”سُنی ہے۔ لیکن وہ تو سب شروع سے لے کر آخر تک جھوٹ ہے۔ تم عقلمند ہو، سب کچھ سمجھتی ہو۔ پھر بھی نہ تو تم سیندور لگاتی ہو، نہ ہاتھوں میں چوڑیاں پہنتی ہو، نہ سُسرال ہی جاتی ہو۔ یہ سب تقدیر کا قصور ہے یا تمہارا اپنا؟ اُس وقت تم نا سمجھ اور ابھان تھیں۔ لیکن اب تو سمجھدار ہو۔ اب تم ہی بتاؤ، ایسی کون سا گنہ ہے جو ناراض ہو کر بیوہ کا بھیس بنا رکھے؟“

”بھائی! میں یہ سب جانتی ہوں۔ لیکن خالی سیندور لگانے اور چوڑیاں پہن لینے سے ہی تو لوگ سہاگن نہیں مان لیں گے۔ پوچھیں گے، تیرا پتی کون ہے؟ اس بات کا گواہ کون ہے؟ اور پھر وہ بھی یونہی کیسے مجھے گھر رکھ لیگا؟“

برجیشوری حیران ہو کر بولی۔ تم کیسی باتیں کرتی ہو، بہن! بھلا اس سے بڑھ کر ثبوت کسی بات کا اور کیا ہو سکتا ہے؟ کیا تم نے کچھ نہیں سنا کہ اس بات کو لے کر نند کا کا کے ساتھ اس گھر میں کیا کچھ ہو چکا ہے؟“ تھوڑی دیر خاموش رہ کر برجیشوری پھر بولی۔ ”تمہارا بھتیجا تو سب کچھ جانتا ہے۔ اُس نے بھی نہیں کہا؟ میرا تو خیال تھا کہ تم سب باتیں سن سنا کر ہی یہاں آئی ہو۔ میں نے اسی لئے تم سے کچھ نہیں کہا۔ خاموش ہی رہی کہ میں تم بُرا نہ مانو، کہیں تمہیں دُکھ نہ ہو۔ بلکہ جس دن تم یہاں آئی تھیں، اُس دن تمہارے یہاں آنے کی وجہ سے مجھے تم پر غصہ بھی آیا تھا“

کسم نے حیران ہو کر جلدی سے پوچھا۔ ”نہیں بھابی! میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ بتاؤ کیا ہوا تھا؟“

برجیشوری نے سر دُا ہر کر جواب دیا۔ ”مُخوب ایسا بھائی ہے، ویسی ہی بہن۔ نندوئی کے ساتھ جب نند کا کا کی لڑکی کی شادی کا انتظام ہوا، تو تم تیرے یا ترا کو گئی ہوئی تھیں۔ اُس وقت تمہارے بھتیجے تو اُس شادی کے خلاف شور مچایا اور آخر میں وہ ہی خاموش ہو رہے۔ میری ساس کی بابت، تمہاری بابت، تمہارے سُسرال والوں کی بابت سب باتیں ہوئیں۔ تب نند کا کا نے اٹھار کر دیا کہ میں پھر اُن کی لڑکی کا رشتہ نہ ٹوٹ جائے۔ اُس کے بعد مندر کے بڑے بابا جی بوائے گئے اور اُنہوں نے آ کر فیصلہ کر دیا

کہ سب جھوٹ ہے۔ کیونکہ پہلے تو انہیں خبر دیئے بغیر، اور اُن کی اجازت حاصل کئے بغیر ہماری قوم میں یہ کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ انہوں نے نند کا کا کو حکم دیا کہ جس نے یہ کام کیا تھا اُسے حاضر کرو۔ اُسی وقت اُس نے یہ بات تسلیم کی تھی کہ کنٹھی ہونے کی بات چلی تھی، کنٹھی بدلی نہیں گئی۔“

کسم حیرت زدہ ہو کر بول اُٹھی۔ ”نہیں ہلی گئی بھابی؟ یہ تو میں بھی دل ہی دل میں جانتی تھی۔ لیکن آخر میرے متعلق اتنی سب باتیں اُٹھیں کیوں؟“

برجیشوری نے ہنس کر کہا۔ ”تمہارے بھائی کو کبھی کبھی جنوں کا دورہ پڑ جایا کرتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو دنیا کی شرم کے مارے کبھی اتنا شور و غل نہ مچانا چاہتا۔ لیکن اُسے تو اس بات کا کوئی خیال ہی نہیں۔ اسی لئے چاروں طرف اپنی بدنامی کی شہرت پھیلانے لگا اور ہر ایک سے کہنے لگا کہ جب ہماری بہن کا کوئی قصور ہی نہیں، جب ہماری ماں نے اُس کی کنٹھی بدلوائی ہی نہیں تو پھر ہمارا ہنوتی اُسے اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتا اور کیوں نند اپنی لڑکی کی شادی اُس کے ساتھ کر رہا ہے؟“

کسم نے شرم سے سر جھکا کر کہا۔ ”چھی! چھی! لیکن آخر ہوا کیا تھا؟“
برجیشوری نے کہا۔ ”پھر کچھ نہیں ہوا۔ میری ساس اور نند کا کا کی بہو دونوں کے والدین ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ غصہ،

شرم، افسوس اور غیرت کی وجہ سے وہ تمہیں یہاں لے آئی، اُن کے لڑکے کے ساتھ ہی تمہاری دوسری شادی کی بات ہوئی تھی، لیکن ہو نہیں سکی۔ اچھا نند بہن، نندوئی جی (بندر ابن) بھی تو سب باتیں اپنے کانوں سے سُن گئے تھے، کیا انہوں نے بھی اشارۃً یا کنایتاً یہ بات تمہیں نہیں بتائی پہلے تو سنا تھا کہ تمہارے لئے وہ.....“

کُسم نے منہ پھیر کر کہا: ”بھابی! معلوم ہوتا ہے کہ اُس دن وہ بھی بات کہنے آئے تھے؟“

برجیشوری نے حیران ہو کر پوچھا: ”کس دن؟ کیا اس دوران میں وہ تمہارے پاس گیا تھا؟“

”ہاں، جس دن ہم یہاں آئے تھے، اُسی دن صبح۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”میرے ناروا سلوک کی وجہ سے کچھ کہے بغیر ہی چلے گئے؟“

برجیشوری نے مسکراتے ہوئے پوچھا: ”کیا کیا تھا تم نے؟“

اپنی جھونپڑی میں گھسنے ہی نہیں دیا یا بات ہی نہیں کی؟“

کُسم نے ایک سرد آہ کھینچی لیکن کوئی جواب نہ دیا۔

برجیشوری نے بھی اور کوئی بات دریافت نہ کی۔ شام کا ہند کا تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سے سنکھوں کی آواز سے چونک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی: ”نند جی تم ذرا پیٹھو میں چراغ جلا کر ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر برجیشوری وہاں سے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد لوٹ کر دیکھا کہ کسٹم وہیں زمین پر اوندھے منہ پڑی
 سسک سسک کر رو رہی ہے۔ چرخ کو لپٹی جگہ رکھ کر وہ کسٹم
 کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور بہت دیر تک خاموشی سے اُس کے سر پر
 ہاتھ پھیرتی رہی۔ اس کے بعد آہستہ سے بولی ”نندھی، تم نے واقعی
 اچھا کام نہیں کیا۔ یہ تو میں نہیں جانتی کہ تم نے کیا کیا تھا۔ لیکن جب
 تم جانتی ہو کہ وہ کون ہے اور تم کون ہو، تو اُن کی اجازت لے بغیر
 تمہارا کہیں بھی جانا ٹھیک نہیں تھا“

کسٹم نے سر نہیں اٹھایا۔ چپ چاپ سُنتی رہی۔
 برجیشوری نے پھر کہا ”تمہارے ہی منہ سے جہاں تک تمہاری
 باتیں سُنی ہیں، اُن سے اندازہ لگا کر میں کہہ سکتی ہوں، کہ اگر میں تمہاری
 جگہ ہوتی تو پیدل چل کر اُن کے گھر جانے کی بات تو کہیں رہی، اگر وہ
 حکم دیتا کہ سارا راستہ ناک رگڑتی آؤ، تو میں ویسا ہی کرتی“
 کسٹم نے پہلے کی مانند زمین پر پڑے پڑے ہچکیاں لیتے ہوئے
 کہا ”بھابی یہ منہ سے تو کہنا آسان ہے لیکن عمل میں لانا بہت مشکل ہے“
 ”بالکل نہیں۔ پیدل جانے سے اگر تپتی ملے، بیٹا ملے، باعزت
 کھانے پینے کو ملے، تو اتنا کچھ ملنے پر عورت کے لئے کونسا کام دُشوار
 ہے؟ مجھے تو اگر یہ بھی نہ ملتا، جب بھی لوٹ کر نہ آتی۔ نکال دینے
 کے باوجود بھی نہیں۔ جان سے تو مار ہی نہ دیتا، پھر اور کس چیز کا خوف
 تھا، بہت کرتا، تو کہہ دیتا، کہ نکل جاؤ۔ میں جواب دیتی۔ کہ تم نکل جاؤ۔

گھر میرا ہے۔ اگر نہ نکلتی تو بتاؤ وہ کیا کرتا ہے؟

برجیشوری کی یہ بات سُن کر اتنے رنج و غم میں بھی کُسم ہنس پڑی۔
لیکن برجیشوری نے اس ہنسی میں اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ واقعی
یہ باتیں اُس کے دل سے نکل رہی تھیں۔ کُسم کو ہنس نے یا تسلی دینے
کے لئے نہیں۔ اُس نے اور بھی زیادہ سنجیدہ ہو کر کہا: ”نند جی، میں
بالکل ٹھیک کہتی ہوں۔ تم کسی کی بات سُنو اور اُس کے پاس چلی جاؤ۔
اس مصیبت کے وقت جتنی اور بیٹے کو تنہا نہ چھوڑ دو“۔

برجیشوری کے لہجے میں اچانک یہ تبدیلی دیکھ کر کُسم سب کچھ
بھول گئی اور فوراً اُٹھ کر پوچھنے لگی: ”مصیبت کے دن کیسے؟“

برجیشوری نے جواب دیا: ”یہ مصیبت کے دن نہیں تو اور کیا
ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ لوگ خیر و عافیت سے ہیں۔ لیکن تمہارے
بھائی کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آجکل باڈل میں ہیضہ کی بیماری بڑے
زوروں پر ہے اور ہر روز دس پندرہ آدمی لقمہ اجل ہو جاتے ہیں“
ہیں، نند جی، یہ کیا کر رہی ہو؟ میرے پاؤں چھوڑ دو“۔

کُسم نے اُس کے دونوں پاؤں پکڑ کر روئے ہوئے کہا: —
”بھائی! وہ میرے پاس چرن کو چھوڑنے آئے تھے۔ لیکن میں نے
نہیں رکھا۔ میں نے اُن کی کوئی بات نہیں سنی۔ بھائی“
برجیشوری نے روک کر کہا: ”اچھا اب تو سُن لیا اب جا کر

لوکے کو سنبھالو“

”اب میں کیسے جاؤں؟“

برجیشوری جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ پیچھے سے کسی کے آنے کی آہٹ سُنانی دی۔ اُس نے مُنہ پھیر کر دیکھا کہ دہلیز میں ماں کو اڑکھولے کھڑی ہے۔ آنکھوں سے آنکھیں ملتے ہی ماں نے طعنہ مار کر کہا۔
”نند جی کو کیا مشورہ دیا جا رہا ہے؟“

برجیشوری نے متانت سے جواب دیا۔ ”ماں اندر آ جاؤ۔ تم ڈرو نہیں۔ اپنے آدمی کو کوئی بُرا مشورہ نہیں دیتا، میں نے بھی نہیں دیا۔“
ماں بہت دیر سے اندر ہی اندر چل بھن رہی تھی۔ بھرک کر بولی۔
”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں لوگوں کو بُری صلاح دیتی ہوں۔
میں نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ یہ کلمہ ہنی گھر میں آئی ہے تو اس میں بھی رُفتنے فساد کی آگ لگا دے گی۔ کُنچ ناتھ اسے پھوٹی آنکھوں نہیں دیکھنا چاہتا۔ آخر کیوں؟ اس کی عادت اور رنگ ڈھنگ کی وجہ سے ہی؟“
برجیشوری بھی ماں کو کچھ ایسا ہی کڑا جواب دینا چاہتی تھی لیکن کسم نے آہستہ سے ہنسی لی، جس سے وہ رُک گئی۔ اور بولی۔
”اسی لئے میں اس کلمہ نہی سے کہہ رہی تھی کہ سسرال چلی جاؤ۔“

یہاں نہ رہو؟

سسرال کا نام سُن کر ماں نے پان سے رنگین ہونٹ پھیلا کر اور اور تلک سے پوتی ہوئی ٹناک کو سکیڑ کر کہا۔ ”کس سسرال میں نند کو بھیجتی ہو، نند ویشنو کے....“

اس دفعہ برجیشوری دھمکا کر بولی "سب کچھ جانتے ہو جھٹمٹے
بھی اسخانی بن کر خواہ مخواہ ایک شریف لڑکی کی بے عزتی نہ کرو۔
لڑکیوں کے دس بیس سسرال نہیں ہوتے۔ اگر آج نندہ ویشنو کا نام بلہا
جائیکا تو کل تمہارے گوردھن کے باپ کا بھی لیا جائیگا۔ اور وہ نہیں
بھی زبان پر تالا لگا کر مننا پڑے گا؟"

لڑکی کا یہ سخت اور صاف اشارہ سن کر ہاں بارود کی مانند بھڑک
اٹھی اور چلا کر بولی "چل کجنت! پٹی ہو کر تو ماں پر بدنامی کا داغ
لگائی ہے؟"

برجیشوری نے جواب دیا "اگر صرف بکواس ہی ہوتی تو خیر تھی۔
یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ تم جیسی دو چار ویشنو عورتوں کی کرتوت دیکھ کر
تو دل چاہتا ہے کہ ہم لوگ اپنے آپ کو ڈوم، چمار یا موچی کہا کریں۔
اپنے آپ کو ویشنو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ خیر جانے دو، زیادہ
بات بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں اس بات کا دکھ ہے کہ میں نے
تمہاری بدنامی کی تو نندہ جی کو باڈل بھیج دو۔ اُس کے بعد جو تمہارے
منہ میں آئے وہ کہہ لینا مجھے اور بھی دس لگالیاں دے لینا پس تمہاری
قسم کھاتی ہوں ماں، میں کچھ نہیں بولوں گی؟"

برجیشوری کے تیز تیروں کی زد میں آکر ماں نے سمجھ لیا کہ اگر
یہ لڑائی اور آگے بڑھی تو شکست کا منہ مجھے ہی دیکھنا پڑے گا۔
اس لئے اچھے کو نرم کر کے کہا "وہاں بھیج دینے سے بھی وہ لوگ

اسے گھر میں کیسے داخل ہونے دینگے؟ برعکس شوری میں تیری نسبت بہت زیادہ جانتی ہوں۔ اُن لوگوں کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور بندرا بن کے ساتھ کسٹم کا کوئی رشتہ نہیں۔ جھوٹی اُمید دلا کر اسے سبز باغ نہ دکھا۔ یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر ہی تیزی سے باہر نکل گئی۔

اُس کے جانے کے بعد جب کسٹم نے اپنا خشک اور زرد چہرہ اُٹھایا تو برعکس شوری اُس کا چہرہ دیکھ کر ڈر گئی پھر بولی۔ ”جھوٹ بات ہے بہن بالکل جھوٹ۔ ماں جان بوجھ کر نہیں ستانے کے لئے جھوٹ بول کر گئی ہے۔ یہ بات میں اُس کی بیٹی ہو کر بھی تمہارے سامنے تسلیم کرتی ہوں۔ اچھا میں ابھی آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر نہ معلوم برعکس شوری کیا سوچ کر جلدی سے اُٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

کنج نے یہ بات درست کر دی کہ مالی حالت بہتر ہونے سے عقل بھی تیز ہو جاتی ہے۔ بیوی اور بہن کی منت سماجت بھی اُسے فرض سے منحرف نہ کرا سکی۔ اُس نے سر ہلا کر کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک ماں نہ کہے، اُس وقت تک چرن کو یہاں نہیں لا سکتا۔“

برعکس شوری نے کہا۔ ”اچھا تو ایک بار جا کر دیکھ ہی آؤ، کہ وہ لوگ خیر و عافیت سے تو ہیں۔“

کنج ناتھ نے آنکھیں پھاڑ کر برعکس شوری کی طرف دیکھتے ہوئے

جواب دیا: ”باپ رے باپ! وہاں تو دس بیس آدمی روز مرتے ہیں“
”اور کوئی آدمی بھیج دو۔ جو جا کر خبر لے آئے۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“

کچھ ناٹھ آدمی کی تلاش میں باہر چلا گیا۔

دوسرے دن کسٹم نہا کر باورچی خانہ میں جا رہی تھی کہ داسی نے آنگن میں جھاڑو دیتے ہوئے کہا: ”بہن ماں نے منع کیا ہے۔ آج تم باورچی خانہ میں نہ جاؤ۔“

یہ بات سنتے ہی کسٹم کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ وہ وہیں کھڑی ہو کر آہستہ سے بولی: ”کیوں؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی،“ کہہ کر داسی پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔
کسٹم واپس آ کر کوہت دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ پہلے ہر روز برجیشوری اتنی دیر میں وہاں کئی چکر کاٹ جایا کرتی تھی۔ لیکن آج اُس کی صورت میں دکھائی نہ دی۔ باہر نکل کر ایک دفعہ اُسے ڈھونڈھ بھی آئی تھی۔ لیکن وہ نہیں ملی۔

وہ اپنی ماں کے کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کسٹم اس کمرے میں نہیں آتی۔ ہر روز دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی تھیں۔ لیکن جب کھانے کا وقت بھی گزر گیا تو غصے اور شک کے مارے کسٹم سے نہ رہا کیا اور وہ پھر ایک دفعہ برجیشوری کو تلاش کرنے کے لئے باہر نکلے۔ اتنے میں برجیشوری کی ماں اُس کے نزدیک آ کر بولی —

”بیٹی، اب اور دیر کیوں کر رہی ہو؟ جاؤ جا کر تالاب میں ایک غوطہ لگاؤ اور دو روٹی کھا لو۔ تمہارا بھائی راتے لینے کے لئے ٹھاکر باڑی گیا ہے“ کسم نے پوچھنا چاہا، لیکن اُس کی زبان نے بولنے سے جواب دیدیا۔ جیسے لکڑی کی مانند اکڑ گئی ہو۔ ماں نے خود ہی محبت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ ”جب تم بند رابن کی بیوی ہو تو اُس کی مانند ہی تم سے چھوت چھات کرنی پڑے گی۔ خیر بچاری اچھی ہی تھی۔ اُس دن ہماری برجیشوری کا رشتہ کرنے آئی تھی۔ اُس نے کتنی ہی باتیں کی تھیں۔ آج چھ دن بچے بچاری فوت ہو گئی۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب مہا پر بھوڑے کو ہی بچائیں۔ ماں، کیا نام ہے، بیٹی لڑکے کا؟ چرن؟ آہا! کتنا خوبصورت بچہ ہے جیسے کسی راجہ کا لڑکا ہو اُسے بھی آج صبح سے دو تین قے اور دست آچکے ہیں؟“ کسم سر ہنچائے خاموش بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں چلی گئی۔

غالباً تین بجے کا وقت ہوگا۔ برجیشوری نے کسم کو تمام کمروں میں ڈھونڈ ڈالا، لیکن کسم کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر اُس نے داسی سے پوچھا۔ ”کیوں رمی، تو نے کہیں نندجی کو دیکھا ہے؟“

داسی نے جواب دیا۔ ”نہیں صبح ہی دیکھا تھا۔“

اپنی بیوی کے رونے کی آواز سن کر کُنج ناتھ کی نیند کھل گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ”یہ کیا ہوا، وہ کہاں چلی گئی؟“

برجیشوری نے روکتے ہوئے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں میں مہا پر“

تالاب، باغ وغیرہ سب جگہ دیکھ آئی ہوں۔ لیکن کہیں دکھائی نہیں دی؟
 برجیشوری کے آنسو دیکھ کر اور تالاب کا نام سن کر کنج ناتھ رونے
 لگا۔ تو پھر وہ زندہ نہیں ہے، ماں کی طغہ زنی وہ برداشت نہیں کر سکی۔
 اس لئے وہ ضرور کہیں ڈوب کر مر گئی ہے؟

یہ کہہ کر وہ دوڑ کر باہر جا رہا تھا کہ برجیشوری نے اُس کا دامن
 پکڑ کر کہا: ”سنو، اس طرح نہ جاؤ“

”نہیں میں کچھ نہیں سُننا چاہتا“

یہ کہہ کر کنج ناتھ ایک جھٹکے سے اپنا دامن چھوڑ کر باہر نکل گیا۔
 قریباً سُن منٹ بعد کنج ناتھ عورتوں کی مانند اونچی آوازیں روتا
 ہوا گھر واپس آیا اور آنگن میں کھڑا ہو کر چلا چلا کر کہنے لگا: ”ماں نے
 میری بہن کو مار ڈالا۔ اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ اس گھر میں پاؤں بھی
 نہیں رکھوں گا۔ ہائے ری کشم“

کنج ناتھ کی ساس کو ابھی معلوم نہیں تھا۔ چلانے کی آواز سن کر باہر
 نکلی اور حیرت سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

برجیشوری نے کنج ناتھ کے پاس جا کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا جا ہا
 لیکن اُس نے دھٹکا دے کر گرا دیا۔ پھل پھٹ، آنکھوں سے دُور ہوا
 مجھے ہاتھ نہ لگا؟

برجیشوری پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس دفعہ زبردستی دھکیلتی
 ہوئی اسے اندر لے گئی، اور بولی: ”کیا رونے چلائے سے تمہاری بہن“

لوٹ آئیگی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ڈوب کر نہیں مری، زندہ ہے۔“
 لیکن کنج کو یقین نہ آیا۔ وہ اُسی طرح اونیچی آواز سے روتا رہا۔
 اسے اپنی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہتا ہوا معلوم ہوا جس میں
 اس کی خود دار چھوٹی بہن کی لاش تیر رہی تھی۔
 بریجیٹوری نے محبت سے اپنے پتی کی آنکھوں کے آنسو پونچھے ہوئے
 کہا: ”آپ حوصلہ کیوں نہیں یقین دلاتی ہوں کہ نند بہن مری نہیں نہ ہے۔“
 کنج ناتھ اشک آلود آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھنے
 لگا۔ اُس کی بیوی نے پھر ایک مرتبہ اپنے آنچل سے اچھی طرح اُس کی
 آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا: ”مجھے یقین ہے کہ نند جی چوری سے باڈل
 چلی گئی ہیں۔“

کنج ناتھ نے بے اعتباری سے سر ہلا کر جواب دیا: ”نہیں“
 نہیں وہ وہاں کبھی نہیں جائے گی۔ چرن کے علاوہ وہاں اور کسی کو
 وہ دیکھ نہیں سکتی۔“

بریجیٹوری نے کہا: ”یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں جس طرح
 تم سے محبت کرتی ہوں، اُسی طرح وہ بھی اپنے پتی سے محبت کرتی ہے۔
 اگر ایسا نہ بھی ہو تو وہ چرن کے لئے بھی تو وہاں جاسکتی ہے۔“
 ”لیکن وہ تو باڈل کا راستہ بھی نہیں جانتی۔“

”یہی تو ڈر ہے۔ اگر کہیں ادھر ادھر بھٹک گئی، تو وہاں پہنچنے
 میں اُسے دیر لگے گی۔ راستے میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ رنہ

اگر باؤل سات سمندر تیرہ ندی پار ہو، تو بھی وہ ایک نہ ایک دن پوچھتی
پوچھتی وہاں پہنچ ہی جائیگی۔ میری بات مانو، تم بھی اُسی راستے چلے جاؤ،
اگر راستے میں کہیں مل جائے تو اپنے ساتھ لے جا کر اُسے اُس کے تہی
کے ہاتھ سوئپ کر چلے آنا۔

”اچھا! جاتا ہوں۔“ کُنچ ناتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

آج اُس کا نحو بصورت چمکیلا ولایتی جوتا، قیمتی ریشمی دوپٹہ اور
پُر وقار رفتار سب سسرال میں ہی پڑے رہ گئے۔ کبخت کسٹم کے
غم میں زمیندار کُنچ ناتھ بالو پھیری والے کُنچ ویشنو کی شکل و صورت
بنائے ننگے پاؤں اور برہنہ بدن پاگللوں کی مانند دوڑتا ہوا چل پڑا،

چودھواں باب

بندر ابن کی ماں کو فوت ہوئے چھٹاون تھا۔ اگر واقعی انسان کو نیک اعمال کے بدلے سترگ نصیب ہوتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ بندر ابن کی ماں کو بھی ضرور سترگ میں جگہ ملی ہوگی اُس دن تارنی کے قابل نفرت رویہ اور گھوٹال کے شاستر گیان اور بددعا سے دکھی ہو کر بندر ابن نے اپنے گاؤں میں جدید طریقہ کا لوہے کے تل والا کنواں بنوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ایسا کنواں بنوانا چاہتا تھا جس کے پانی کو کوئی کسی طرح بھی خراب نہ کر سکے اور پانی نکالنے میں بھی زیادہ محنت اور وقت صرف نہ کرنا پڑے۔ تاکہ گاؤں کے تمام لوگوں کی مصیبت دور ہو جائے۔ اور ہر سال پیٹنے کی وبا سے سینکڑوں ہی قیمتی جانیں ضائع ہونے سے بچ جائیں وہ اپنی اس خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سرمایہ صرف کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس لئے اُس نے کلکتہ کی ایک مشہور

فرم کو بیٹھی لکھ کر اُس کے کارندوں کو بلوایا تھا۔ جس دن اُس کی والدہ کی وفات ہوئی، اُسی دن صبح وہ ان کے ساتھ بیٹھ بات چیت میں مصروف تھا اور شرائط کر رہا تھا۔ قریباً دس بجے کا وقت ہو گا کہ داسی نے گھبراہٹ ہوئے باہر آ کر کہا،

”بابو جی اتنا دن چڑھ آیا، لیکن ماں نے ابھی تک دروازہ نہیں کھولا؟“

بندرا بن نے حیران ہو کر پوچھا یہ کیوں ماں ابھی سو کر نہیں اُٹھیں؟
بندرا بن گھبرا کر وہاں سے دوڑا ہٹوا آیا اور کواڑوں کو کھٹ کھٹا کر پکارنے لگا، ”ماں! ماں!“

لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ گھر بھر کے سب لوگ چلا چلا کر پکارنے لگے۔ پھر بھی اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ پھر لوہے کے ایک موٹے سے ڈنڈے کے ساتھ بند دروازے کو توڑ کر کھولا گیا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر سے اس قدر بھیا نک بدبو آئی کہ سب نے ناک پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف مُنہ پھیر لیا۔ بندرا بن نے فوراً ہی بدبو کے جھونکے سے سنبھل کر اندر جھانک کر دیکھا۔

پتک خالی پڑا تھا اور ماں زمین پر پڑی تھی۔ تمام کمرے میں بیٹھے کے بھیا نک حملے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ جب تک اُس میں اُٹھنے کی طاقت رہی، اُس وقت تک تو وہ اُٹھ کر باہر آتی رہی بالا آخر کمزور اور مڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی اور پھر نہ اُٹھ سکی۔

وہ زندگی میں کسی کو تھوڑی سی تکلیف بھی نہ دینا چاہتی تھی۔ اس لئے رات کو آخری دم تک بھی گھر کے لوگوں کو جگانے میں اُسے پس پشیمان نہ رہا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رات بھر اُس پر کیسی گوری ہوگی۔ ماں کی اس طرح سے اچانک دردناک موت اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بڑا کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ بندہ رابن بھی برداشت نہ کر سکا۔ تاہم اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے ایک بار دروازے کی چوکھٹ کو زور سے پکڑ لیا، لیکن اسی وقت بیہوش ہو کر ماں کے پاؤں میں گر پڑا۔ لوگ اُسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب اُسے ہوش آیا تو دیکھا، کہ چترن اُس کے سر ہانے بیٹھا رو رہا ہے۔ بندہ رابن اُٹھ بیٹھا اور چترن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی ماں کے پاؤں کے پاس خاموش بیٹھ گیا۔

جو آدمی ڈاکٹر کو بلانے گیا تھا اُس نے واپس آکر جواب دیا کہ ڈاکٹر نہیں ملا۔ کہیں باہر گیا ہے اور آج تمام دن اُس کے آنے کی امید نہیں۔ بندہ رابن کی ماں کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ لیکن آنکھوں میں ابھی تک طاقت وید موجود تھی۔ بیٹے اور پوتے کو اپنے پاس دیکھ کر اُس کی بے نور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہونٹوں نے بار بار کانپ کر نوکرانیوں وغیرہ سب کو ڈیڑی عادی۔ گو کوئی اسکے الفاظ کو سن نہ سکا لیکن اس کا محبت بھرا پیغام سب کے دلوں تک پہنچ گیا۔

اسے تلسی کے پودے کے پاس کپڑا بچھا کر لٹا دیا گیا اور تھوڑی دیر
 پہ تلسی کے پودے کی طرف ٹٹکی لگائے دیکھتے رہنے کے بعد اُسکی
 بے نور اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دُنیا کی بے ثباتی کو دیکھتی ہوئیں
 کبھی نہ ٹوٹنے والی گہری نیند میں محو ہو گئیں۔

اس کے بعد بند راہن نے یہ چھ دن اور چھ راتیں صرف اس لئے
 گزاریں کہ یہ سب باتیں ایشور کے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ اگر بند راہن کے
 اپنے ہاتھ میں ہوتا تو ایک منٹ بھی زندہ نہ رہتا۔ لیکن چرن نہ تو اب
 کھیلتا تھا اور نہ کسی سے بولتا ہی تھا۔ بند راہن نے اُسے طرح طرح کے
 قیمتی کھلونے خرید دیئے۔ کئی طرح کی گاڑیاں، جہاز اور جانوروں
 کی تصویریں لے دیں جن کو لے کر وہ اس سے پہلے دن رات مست
 رہتا تھا۔ لیکن اب دل بہلاوے کی یہ سب چیزیں گھر کے ایک کونے
 میں پڑی ہوئی تھیں، اور وہ انہیں چھو تا بھی نہیں تھا۔

اُس مصیبت کے دن اس معصوم بچے کی طرف کسی کا دھیان نہ
 گیا۔ جس وقت لوگ اُس کی دادی کو سفید چادر سے ڈھانپ کر اٹھتی
 پر رکھ کر زور زور سے ہری نام کا ورد کرتے ہوئے شمشان بھومی
 میں لے جانے لگے، اُس وقت وہ پاس ہی کھڑا آنکھیں پھاڑ
 پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے دل میں ہر وقت یہی سوچا کرتا کہ دادی
 مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئی۔ بیل گاڑی کے بدلے آدمیوں
 کے کندھے پر کیوں سوار ہوئی، اس طرح سر سے پاؤں تک سفید کپڑے

میں بوس ہو کر چپ چاپ کیوں چلی گئی اور اب تک واپس کیوں نہیں آئی۔ بابو جی راتوار و کیوں رہے ہیں؟ یہ سب باتیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ اُس کی اس گھبراہٹ، بے چینی اور دکھ درد سے مڑ جھلتی ہوئی صورت نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ لیکن اپنے باپ نگاہوں کو وہ اپنی طرف نہ کھینچ سکا۔ ماں کی اس اچانک وفات نے بند را بن کو اس طرح بے حواس کر دیا تھا کہ کسی کی بات کی طرف دھیان دینے، یا کسی کی بات پر ہوشیار نہ غور کرنے کی اُس میں طاقت ہی نہ رہی تھی۔ اُس کی اُداس اور آنسو بھری نگاہوں کے سامنے ہر چیز دھندلا گئی تھی۔ کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اس دوران میں کچھ دنوں سے شام کے وقت اُس کے استاد بابو دُرگا داس اُس کے پاس آ بیٹھتے تھے، اُسے تسلی بخشی دیتے تھے اور سمجھاتے بھجھاتے رہتے تھے۔ لیکن بند را بن کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی۔ اور وہ ہر وقت اسی خیال میں متغیر رہتا تھا کہ سمندر کے لیے پایاں پانی میں اُس کا شمسکتہ جہاز بھنور میں اس بُری طرح پھنس گیا ہے کہ ہزار کوشش اور انتہائی جدوجہد کے باوجود اس کے ساحل تک پہنچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ پھر جب اس نے ہر حال ڈونہا ہی ہے تو اُس کے لئے رومنے سے کیا حاصل؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو میری عورت آغاز شباب میں ہی چرن کو چھوڑ کر نہ مر جاتی۔ اس مصیبت کے وقت شاید کسم کو ہی رحم آجاتا اور وہ اس طرح سنگ دل ہو کر چرن کو اپنے پاس رکھنے سے انکار نہ کر دیتی

پھر سب سے بڑھ کر میری ماں، ایسی ماں کب کسی کو ملتی ہے وہ بھی گویا اپنی خوشی سے رخصت ہو گئی اور چلتے وقت ایک بات بھی نہیں کہہ گئی اس طرح جب اس کی بے دلی اور بدحواسی ہر ایک بات سے ظاہر ہونے لگی تو ایک دن گھر کی داسی نے روتے روتے شکایت کے انداز میں کہا۔ ”بابو جی، کیا اب بچے سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے؟ آپ اسے اپنے پاس نہیں بلاتے، پیار بھی نہیں کرتے، ذرا اس کی حالت تو دیکھو کیسی ابتر ہو گئی ہے؟“

داسی کی یہ بات بند راہن پر لاطھی کی مانند پڑی جیسے اس نے اس کی گہری نیند کی مدہوشی کو توڑ دیا ہو۔ حیران ہو کر ٹوچھا۔
”کیوں چرن کو کیا ہوا ہے؟“

داسی نے مضطرب ہو کر جواب دیا۔ ”ایشور نہ کرے اس کو کچھ ہو۔ آؤ بیٹا چرن! یہاں آؤ۔ دیکھو بابو جی بلا رہے ہیں؟“
چرن پڑمردہ چہرہ لئے اور رونی صورت بنائے آہستہ آہستہ آڑ میں سے نکل کر سامنے آیا۔

اتنے ہی بند راہن نے جھپٹ کر اسے اپنی چھاتی سے لگا لیا اور یکا یک رو کر کہا۔ ”کیوں چرن! کیا تم بھی چلے جاؤ گے بیٹا؟“
داسی نے بگڑ کر کہا۔ ”ہیں! بابو جی، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“
بند راہن نے نادم ہو کر آنکھیں پونچھیں اور بہت دنوں کے بعد کچھ ہنسنے کی کوشش کی۔

جب داسی اپنے کام پر چلی گئی تو چرن نے آہستہ سے کہا — ”با بوجی“
میں مل کے پاس جاؤنگا“

بندر ابن کو یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ یہ دادی کے پاس جانا نہیں
چاہتا۔ اُس نے بڑے پیار سے کہا — ”بیٹا تمہاری ماں تو اب وہاں
نہیں رہتی۔“
”کب آئیگی؟“

”یہ تو معلوم نہیں بیٹا، اچھا آج ہی میں آدمی بھیج کر معلوم کرتا ہوں۔“
چرن بہت خوش ہوا۔ بندر ابن نے بہت دیر تک غور کرنے کے
بعد اسی دن کیشب کو خط لکھ دیا اور اپنے گاؤں کی ابتر حالت لکھنے کے بعد
اس سے درخواست کی کہ وہ چرن کو آکر لے جائے ۔

مال کی کربا کر م کے اب صرف دو بچے باقی تھے۔ صبح کو بندر ابن
چنڈی منڈپ کے کام میں لگا ہوا تھا جب یہ خبر ملی، کہ اندر چرن کو قے
اور دست آرہے ہیں۔ وہ دوڑتا ہوا اندر گیا، دیکھا کہ چرن بے جان
لاش کی مانند بستر پر پڑا ہے اور اُس کے دستوں کی شکل میں تباہی
کے بھیاں آٹار دکھائی دے رہے ہیں ۔

بندر ابن کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اُس کے
ہاتھ پاؤں بیکار ہو گئے۔ وہ اپنے لڑکے کی چارپائی کے نیچے بے جان
بت کی مانند یہ کہتا ہوا گر پڑا کہ فوراً جا کر کیشب کو خبر کر دو ۔
اس کے قریب ایک گھنٹہ بعد بندر ابن کو پال ڈاکٹر کی بیٹھک میں

اُس کے دونوں پاؤں پکڑے کہہ رہا تھا: ڈاکٹر صاحب، مہربانی کر کے اس بچے کی جان بچائیے۔ میں نے خواہ کتنے گناہ کئے ہوں، لیکن یہ بیچارا بے گناہ ہے۔ بالکل معصوم بچہ ہے ڈاکٹر صاحب۔ ایک دفعہ چل کر دیکھ لیجئے۔ اُس کی تکلیف دیکھ کر آپ کو بھی رحم آ جائے گا۔“

گوپال نے منہ بنا کر جواب دیا: ”کیا اس وقت بھول گئے تھے، کہ تاریکی کچھ ادا پا دھیائے انہیں ڈاکٹر صاحب کے ماموں ہیں؟ شور ہو کر روپے کی طاقت میں براہمن کی بے عزتی! اُس وقت خیال نہیں آیا کہ انہیں کے پاؤں پر سر رکھنا پڑے گا؟“

بند راہن نے روتے ہوئے کہا: ”آپ براہمن ہیں۔ میں آپ کے پاؤں چھو کر کہتا ہوں کہ تاریکی ہمارا ج کی میں نے کوئی بے عزتی نہیں کی۔ میں نے جو انہیں روکا تھا، وہ سارے گھاؤں کی بھلائی کو مد نظر رکھ کر ہی روکا تھا۔ آپ ڈاکٹر ہیں، آپ جانتے ہیں کہ اس وقت تالاب کا پانی جیسے ہم سب پینے اور دیگر ضروریات میں استعمال کرتے ہیں خراب کرنا کتنا ظلم ہے؟“

گوپال نے پاؤں چھڑا کر جواب دیا: ”ہاں، ہاں، ظلم کیوں نہیں ہے۔ ماموں جی نے بہت بڑا ظلم کر دیا۔ میں ڈاکٹر ہوں، میں نہیں جانتا، تم درگا داس سے انگریزی کے چار حرف پڑھ کر مجھے عقل سکھانے آئے ہو! اتنے بڑے تالاب میں دو کپڑے دھونے سے پانی خراب ہو جاتا ہے ہم گویا بدھو ہیں، ہمیں کوئی عقل نہیں اور تم ہو

بڑی عقل والے، یہ سب روپوں کی گرمی بہے شودر کے پاس جب دولت آجاتی ہے، تو اُس کا دماغ ہی بگڑ جاتا ہے۔ ورنہ کیا تم براہمن کے لئے تالاب کا گھاٹ بند کر دیتے؟ اتنا غرور! اتنا تکبر! جاؤ، جاؤ۔ میں تمہارے مکان میں پاؤں بھی نہیں رکھ سکتا۔

دیہے کی تکلیف کا خیال کر کے بند راہن کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ وہ پھر ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ کر منت سماجت کرنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب، میں اپنا گناہ تسلیم کرتا ہوں، آپ کے چرنوں کی خاک پیشانی پر لگاتا ہوں، ڈاکٹر صاحب ایک بار چلئے۔ لڑکے کی جان بچا دیجئے۔ میں شور و پیہ ڈونگا، ڈونبہ ڈونگا، پانچ شوڈونگا، آپ جو کچھ کہیں گے وہی ڈونگا۔ چلئے اور دوا دیجئے۔

پانچ شور و پیہ! اپنا اثر دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب نرم پڑ گئے۔ تحقیر کی دھکتی ہوئی آگ پر پانی پڑ گیا۔ بولے — ”بھیتام سب جانتے ہیں اس لئے صاف صاف کہتا ہوں — تمہارے گھر جاؤں گا تو برادری سے خارج کر دیا جاؤں گا۔ ابھی ابھی وہ لوگ آئے تھے! نہیں بھائی، تارنی ماموں اجازت نہیں دینگے۔ گاؤں کے سب براہمن میرے ساتھ ملنا جلنا اور رشتہ طالعہ بند کر دینگے۔ اگرچہ میں ڈاکٹر ہوں اور مجھے ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے مریض کی دیکھ بھال کرنی چاہیئے لیکن میں تمام برادری سے تو نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر ایسا کروں، تو پھر لڑکے لڑکیوں کی بیاہ شادی کیسے کروں گا؟ کل کو اگر میری

ماں مرجائے تو اُس کی تجہیز و تکفین کیسے ہوگی۔ تمہیں لے کر تو میرا کام نہ چلے گا۔ تم ایک کام کرو، گھوٹال ہمارے کو لے کر ماموں جی کے پاس جاؤ، وہ بوڑھے آدمی ہیں، اُن کی بات سب مانتے ہیں۔ ذرا اُن کے سامنے ہاتھ جوڑو! بس وہ ایک دفعہ کہیں، میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔ دیکھو میں ابھی ابھی نئی اور بہت بڑھیا دوا لایا ہوں۔ دیتے ہی لڑکا تندرست ہو جائیگا۔“

بند راجن مضطرب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ گوپال نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا: ”نہیں نہیں، تم گھبراؤ نہیں۔ جاؤ، دیر نہ کرو۔“ اور دیکھو بھتیجا! وہاں روپوں کا ذکر نہ کرنا۔ جاؤ، جلدی کرو۔“

بند راجن روتا ہوا دوڑا اور تارتی کے پاؤں میں جا پڑا۔ تارتی نے لات مار کر اپنا پاؤں چھڑاتے ہوئے ہنس کر کہا: ”میں بغیر پوجا پاٹھ سکے پانی نہیں پیتا۔ کیوں، میرا کنا سچ ہونا۔ بے بس ہوئے یا نہیں؟“ بند راجن کے رونے کی آواز سن کر تارتی کی بیوی باہر نکلی اور خود رو پڑی۔ بٹی سے بولی: ”چھی چھی! ایسا ظلم نہ کرو یہ پاپ ہے۔ بڑھونا تھا وہ ہو گیا۔ ہائے چھوٹا سا معصوم بچہ ہے۔ گوپال سے کہو کہ وہ جا کر دوا دیدے۔“

تارتی نے چلا کر کہا: ”ٹھیک حرامزادی، مردوں کے درمیان نہ بول۔“

اُس نے سپٹا کر بند راہن سے کہا — ”جاؤ پٹا، میں دُعا دیتی ہوں، تمہارا لڑکا اچھا ہو جائیگا۔“ یہ کہہ کر وہ آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئی۔

بند راہن بہت گڑ گڑا کر منت سماجت کرنے لگا۔ تارنی کے ہاتھ پکڑے، پاؤں پر سر رکھا، مگر نہیں، پھر بھی نہیں۔ اسی وقت شاستروں کے ٹھیکیدار گھوٹالہ ماشے ساتھ کے مکان سے کھڑاؤں سے کھٹ کھٹ کرتے آ پہنچے۔ سب ماجرا سن کر خوش ہو کر بولے —
 ”شاستروں میں لکھا ہے کہ اگر کتے کو ٹکڑا ڈالا جائے تو وہ سر پر چڑھنے لگتا ہے۔ اگر چھوٹے آدمیوں کو سزا نہ دی جائے تو قوم اور دھرم ہی تباہ ہو جائیں۔ اسی لئے تو کلجنگ میں دھرم، کرم اور براہمنوں کا ادب اور احترام نہیں رہا۔ کیوں تارنی جی، اُس دن تم کو کہا تھا نا کہ بند راہن بہت بڑھ چلا ہے! جب اُس نے میری بات نہیں مانی تو مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کی تقدیر برگشتہ ہو گئی ہے۔ اب یہ نہیں بچ سکتا۔ دیکھا تارنی، ہاتھوں ہاتھ پھل مل گیا نا؟“

تارنی نے دل ہی دل میں خوش ہو کر جواب دیا — ”اور میں، میں نے بھی تو اُس دن تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر بد دُعا دی تھی کہ تمہارا نام و نشان مٹ جائیگا۔ چچا ابیں پوچھا پٹھ کئے بغیر پانی نہیں پیتا۔ اب بھی چاند اور سورج ملتے ہیں۔ سمندر میں اب بھی جوار بھاٹا آتا ہے۔“ یہ کہہ کر تارنی اکلوتے بیٹے

کے غم میں جو اس باغی تھے تھے بد نصیب باپ کی ذہنی اذیت کو بڑے تکبر اور غرور سے دیکھ کر سکھ کا احساس کرنے لگا۔ جس طرح کوئی شکاری اپنے تیر سے گھائل ہو کر زمین پر ترپتے ہوئے شکار کو دیکھ کر اپنے بے خطا نشانے کا مزہ لے رہا ہو۔

بندر ابن اٹھ کھڑا ہوا اپنے تھے کی جان بچانے کے لئے وہ بہت منت سماعت کر چکا تھا۔ بہت ہاتھ پاؤں جوڑ چکا تھا۔ اب اُس نے ایک بات بھی نہیں کہی۔ زمانے بھر کی جہالت اور نام نہاد ادبھی جاتیوں کے جھوٹے غرور اور ناقابل برداشت ظلم نے اُس کے بیٹے کی جھگڑائی کی تکلیف کو فراموش کر کے اُس کے دل میں دینی ہونی خود داری کو بیدار کر دیا۔ ران کی خرافات کے ختم ہونے سے پہلے ہی چپ چاپ وہاں سے چلا آیا راستے میں وہ سوچنے لگا کہ جو کام اس نے گاؤں بھر کی بہتری اور بہبود کو مد نظر رکھ کر کیا تھا اُس کی پاداش میں دھرم کے یہ ٹھیکیدار برہمن کس طرح اپنے گائتری کے پاٹھ اور پوجا کے اثر سے اس کو اولاد سے محروم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

دش بچے کے قریب وہ بالکل مایوس اور لاچار ہو کر اپنے جان کنی میں مبتلا بیٹے کی چارپائی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کیشب اُس وقت آگ جلا کر چرن کے ہاتھ پاؤں سینک رہا تھا۔ جدر بن کے منہ سے سب حال سن کر اُس کے منہ سے نکلا۔ ”اُف! مکان کی دیواروں، چھتوں اور زمین کے ذرے ذرے سے بھی دھرم

اور مذہب کے نام پر کئے گئے اس ظلم کی داستان سن کر نکلا۔ اُف! کیشب اٹھ کھڑا ہوا اور ایک دوپٹہ کندھے پر ڈال کر بولا — ”میں نکلتے جاتا ہوں۔ اگر ڈاکٹر مل گیا تو شام تک آ جاؤں گا۔ اور اگر نہ ملا تو یہ میری آخر آمد سمجھو۔ اُف! یہی براہمن کسی دن دُنیا بھر میں قابلِ پرستش سمجھے جاتے تھے، افسوس یہ حالت دیکھ کر کلیجہ مُٹنے کو آتا ہے۔ اگر وہ سب کے تو اس کے کو بچائے رکھنا بھیا۔ یہ تمہارے کیشب چلا گیا، کیشب کے چلے جانے کے بعد چرن نے باپ کو اپنے پاس دیکھ کر زور زور سے رونا شروع کیا۔ بالیجی، میں ماں کے پاس جاؤں گا۔ وہ فطرتاً بڑا احلیم الطبع لڑکا تھا کبھی کسی بات کے لئے خمد کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ لیکن آج اُسے بہلانا مشکل ہو گیا۔ بچوں بچوں دن ڈھلنے لگا، تکلیف متواتر بڑھتی ہی گئی۔ پیاس کی شدت اور ماں کے پاس جانے کے لئے پاگلوں کی مانند چیخ پکار سے اُس نے سب کو پریشان کر دیا۔ اُس کا یہ رونا تیسرے پہر بند ہوا جب اُس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے۔ اور گلا خشک ہو گیا +

ماہِ چیت کا چھوٹا دن ختم ہونے کے قریب تھا جب کیشب ڈاکٹر کو لئے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر اُس کا مہربان اور خاص دوست تھا۔ اندر پاؤں رکھتے ہی چرن کی طرف ایک نظر دیکھ کر وہ سنجیدہ صورت بنا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ کیشب نے دُرتے دُرتے اُس کے مُنہ کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا،

لیکن بند را بن کی طرف دیکھ کر خاموش رہ گیا ۛ
یہ دیکھ کر بند را بن نے بڑے سکون اور تحمل سے کہا: ہاں میں ہی
اس کا بد نصیب باپ ہوں۔ لیکن جھکے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ جو
کچھ کہنا چاہتے ہیں بے فکر ہو کر کہیں۔ ڈاکٹر صاحب، جو باپ اپنے اکلوتے
بیٹے کو بغیر کوئی دوا دینے کو دیں لے کر بیٹھا رہ سکتا ہے۔ وہ سب کچھ
برداشت کر سکتا ہے“ ۛ

باپ کا اتنا حوصلہ اور مضبوط دل دیکھ کر ڈاکٹر حیران رہ گیا۔ تاہم
ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ انسان تھا۔ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اُس کے
سامنے کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ بند را بن مطلب سمجھ کر
بولایا: کیشتب میں جاتا ہوں۔ بغل میں ٹھاکر جی والی کو ٹھٹری ہے ضرورت
ہو تو بلا لینا۔ ہاں ایک بات اور بھی ہے اس کے مرنے سے پہلے ایک دفعہ
مجھے خبر دیدینا۔ تاکہ میں ایک دفعہ اور اسے جی بھر کر دیکھ لوں“ ۛ

جس وقت بند را بن ٹھاکر جی والی کو ٹھٹری میں داخل ہوا، تاریکی
پھیل رہی تھی۔ اُس نے دائیں جانب دیکھا جہاں چند دن پہلے اُس
کی ماں بیٹھ کر پاٹھ کیا کرتی تھی اچانک اُسے اُس دن کا واقعہ یاد
آگیا، جس دن وہ کنج کا پیغام آنے پر اُس کے گھر گیا تھا، جس دن
ماں کشم کے ہاتھوں میں کرٹے پہنا کر اور دُعا دے کر گھر آئی تھی۔ اور
وہ خود خوشی سے پاگل ہو کر پتھے دل سے ٹھاکر جی کے چرنوں میں اپنی
عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے چُپ چاپ اس کو ٹھٹری میں داخل

ہوا تھا۔ لیکن آج وہ کیا دُعا مانگنے آیا ہے؟ زمین پر لیٹ کر اس نے
 کہنا شروع کیا۔ ساتھ کی کوٹھڑی میں میرا چہرہ دم توڑ رہا ہے۔ بھگوان
 میں فریاد لے کر نہیں آیا لیکن مجت پداری کا جذبہ بھی تو تمہی نے دیا
 ہے، پھر باپ کی آنکھوں کے سامنے علاج معالجے کے بغیر اس کے
 چشم و چراغ کی اس طرح ہتیا کیوں ہونے دی۔ باپ کے دل کی تھوڑی
 بہت تسکین کا سامان بھی کیوں باقی نہیں چھوڑا؟ پھر اُسے پُرانا
 واقعہ یاد آگیا، جسے عام طور پر لوگ ایک دوسرے کو سناتے رہتے
 ہیں کہ اشور جو کچھ کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں
 سوچا، جو لوگ تم پر یقین نہیں کرتے، اُن کے متعلق تو وہی جانیں،
 لیکن مجھے تو پورا اعتماد ہے کہ تمہاری مرضی کے بغیر درخت کا ایک پتہ
 بھی زمین پر نہیں گر سکتا۔ اس لئے اے دُنیا کے مالک! آج میں
 صرف یہی دُعا کرتا ہوں کہ اس چھوٹی سی معصوم ہستی کے مرنے سے دُنیا
 میں کس شخص کا کیا بھلا ہوگا یہ مجھے سمجھا دو؟ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ ایشور
 کے سب کام انسان کی محدود عقل سے بالا ہیں پھر بھی وہ اپنی ساری فہم
 اور فراست خرچ کر کے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ چہرہ کیوں
 پیدا ہوا، وہ کیوں اتنا بڑا ہوا، اور اُسے ایک بھی دُنیاوی کام سر انجام
 دینے سے پہلے ہی واپس کیوں بلایا گیا؟

تھوڑی دیر بعد جب رات کی آرتی وغیرہ کے لئے پُجاری اندر
 آیا تو اُس کے پاؤں کی آہٹ سے بند راہن کا سلسلہ خیالات

ٹوٹ گیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا، اُس کا غمگین دل بہت حد تک تسکین پا چکا تھا۔ اگرچہ آسمان پر ابھی چاند طلوع نہیں ہوا تھا تو بھی شفاف نیلے اور بے شمار ستاروں سے جگمگاتے ہوئے آسمان پر شفقت کی نورانی کرنوں کی مدھم روشنی اُس کی آمد آمد کا پیغام دے رہی تھی، دُور کیس جنگل میں چکواچکوی منتظر نگاہوں سے اُس کا استقبال کرنے کے لئے میٹھے نغمے لاپ رہے تھے۔ اور آئندہ زندگی کے مہم سنہری خواب دیکھ رہے تھے۔

باہر آنے پر آگن میں ایک طرف دروازے کی آٹریں ایک اندر اور غمگین عورت کو دیکھ کر بند رابن کو بڑی حیرت ہوئی! اس وقت اندھیرے میں یہاں کون بیٹھا تھا؟

بند رابن نے پاس پہنچ کر ایک ہی نظر میں جان لیا، کہ یہ کسٹم ہے اس کی زبان پر بیساختہ آیا کسٹم! کیا تم میری بربادی کا منظر دیکھنے آئی ہو؟ لیکن وہ کچھ سوچ کر رُک گیا۔

ابھی ابھی وہ اپنے چہرے کی رُوح کی بھلائی کے لئے وہ اپنا سب کچھ دکھا اور مان اپنا تیاگ کر آیا تھا۔ پھر کسٹم کے دل کو دکھا کر وہ اپنے بستر مرگ پر پڑے ہوئے بیٹے کی نجات کا راستہ کیوں بند کرے اس خیال سے وہ چپ ہو رہا اور روندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اگر تم ذرا اور پہلے آجائیں تو چہرے کی بہت بڑی آرزو پوری ہو جاتی۔ آج دن بھر اُس نے جتنی تکلیف اٹھائی ہے، اتنا ہی وہ تمہارے پاس جانے

کے لئے روپا ہے۔ آہ، اُسے تم سے کتنی محبت تھی؛ لیکن اب تو اُسے ہوش ہی نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔“

کسٹم چپ چاپ پتی کے پیچھے چل پڑی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر بند راہن نے ہاتھ سے چرن کے بیہوش اور بڑا مردہ چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”وہ دیکھو! تمہارا چرن پڑا ہے۔ جاؤ اُسے لے لو۔ کیشب! یہ چرن کی ماں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

دوسرے دن صبح جب اور کسی کو کسٹم کے نزدیک جا کر چرن کی لاش مانگنے کی ہمت نہ پڑی، یہاں تک کہ کٹیج ناٹھ بھی ڈر کر پیچھے ہٹ گیا، تو بند راہن نے آہستہ سے پاس جا کر کہا: ”کسٹم اب چرن کی لاش کو پکڑے رہنے سے کیا فائدہ؟ چھوڑ دو، وہ لوگ لے جائیں۔“ کسٹم نے ہر اٹھا کر کہا: ”اُن لوگوں سے آنے کے لئے گمراہ، میں خود ہی اٹھائے دیتی ہوں۔“

اس کے بعد کسٹم نے ایک بار دونوں ہاتھوں سے چرن کی لاش کو اپنے سینے سے پیچ کر آخری بار اُس کا منہ چوما اور اپنے عزیزانہ جان چرن کو شمشان بھیج دیا۔ اُسے دیکھ کر بند راہن بھی دل ہی دل میں ڈر گیا۔

پندرہواں باب

چہرہ کے چھوٹے سے جسم کو حل کر رکھ ہوتے دیر نہیں لگی۔ کیشب اس کے ننھے جسم کو دیکھتی ہوئی آگ میں جلتے دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر چلا اٹھا۔ ”یہ سب جھوٹ ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ایشور جو کچھ کرتا ہے، بھلائی کے لئے ہی کرتا ہے۔ وہ لوگ شیطان ہیں! حرامزادے ہیں! بد معاش ہیں!!“

بند راہن پاس ہی گھٹنوں میں سر چھپائے خاموش بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنی تھکی ہوئی سرخ انکارے کی سی آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا۔
”کیشب! شمشان بھومی میں غصہ نہیں کرنا چاہیے۔“

جواب میں کیشب صرف ”اُف“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔
شمشان سے ٹوٹ کر آتے وقت راستے میں ایک جگہ ہیڑ کے نیچے باریگروں کے دو تین بچے کھیل رہے تھے۔ بند راہن کھڑا ہو کر ایک ٹک اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ جب بچے کھیلتے کھیلتے وہاں سے

بھاگ کر دوسرے درخت کے نیچے چلے گئے تو بند رابن نے ایک ٹھنڈی
 آہ بھر کر اپنے دوست کے مُنہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا — ”جو
 سوال کل سے دن رات میرے دل کو بے چین کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے
 کہ اُس کا جواب مجھے مل گیا ہے۔ دُنیا میں اکلوتے بیٹے کے مرنے کا بھی
 کوئی مقصد ہے“

کیشتب اب تک پانچلوں کی مازند باب جھاک کر رہا تھا۔ اچانک
 یہ انوکھا اصول سُن کر حیران رہ گیا +

”تمہارے کوئی اولاد نہیں۔ اس لئے تم ہزار کوشش کرنے پر بھی
 میرے اندر سُکلتی ہوئی آگ کو سمجھ نہیں سکتے۔ سمجھنا ہے بھی کُتھن۔ یہ
 آگ ایسی ہے، جس کی کوئی اپنے بڑے سے بڑے دُشمن کے لئے
 بھی خواہش نہیں کرتا۔ لیکن کیشتب، اس کی بھی کچھ قیمت ہے اور
 اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی کتنی بڑی قیمت ہے۔ اس لئے معلوم
 ہوتا ہے کہ بھُلوان نے ہی اس کی قیمت مقرر کی ہے“

کیشتب خاموش اُس کے مُنہ کی جانب دیکھتا رہا۔ بند رابن پھر
 کہنے لگا — ”ان بچوں کو دیکھ کر میرے دل کی وحشت ہوئی آگ ٹھنڈی
 ہوتی جا رہی ہے — آج میں تمام بچوں کی شکل میں چرن کی شکل
 دیکھ رہا ہوں۔ اب مجھے سب بچوں کو پہنچ کر کلیجے سے لگا لینے کی خواہش
 ہوتی ہے۔ جب تک چرن زندہ تھا، اُس وقت تو کبھی ایک دن بھی
 ایسی خواہش نہیں ہوئی تھی“

کیشب چُپ چاپ سُنتا ہوا سر جھکا کر اُس کے ساتھ چلتا رہا۔
 پانٹھ سالہ کا طالب علم بن مالی اور اُس کا چھوٹا بھائی دونوں کھانا
 اور پانی لئے جارہے تھے۔ بندرا بن نے پکار کر، ٹوچھا — ”بن مالی،
 کہاں جاتے ہو؟“

بن مالی نے جواب دیا — ”پنڈت جی، بابو جی کو کھانا دینے
 کے لئے کھیت پر جا رہا ہوں۔“

”ذرا تم دونوں بھائی میرے پاس لو آؤ“ کہہ کر بندرا بن نے دونوں
 ہاتھ بڑھا کر دونوں بچوں کو ایک ساتھ کھینچ کر گلے سے لگا لیا، اور
 بڑی محبت سے اُن بچوں کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا — ”آہا،
 بن مالی، دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ کیشب، کل میں بہت ڈر رہا تھا
 کہ واقعی میں نے چرن کو کھو دیا ہے۔ لیکن اب ڈر نہیں رہا۔ اب
 وہ کھونے کا نہیں۔ ان ہی بچوں میں میرا چرن بلا ہوا ہے اور ان
 میں سے ہی میں ایک دن اُسے پھر ڈھونڈ لوں گا۔“

کیشب نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھ کر کہا —
 ”بندرا بن، ان بچوں کو چھوڑ دو۔ اگر ان کی ماں یا کسی اور رشتہ دار
 نے دیکھ لیا، تو بہت ناراض ہو گا۔“

”اوہ! یہ تو ٹھیک ہے۔ میں چرن کو جلا کر جو آ رہا ہوں۔“ یہ

کہہ کر بندرا بن اُنہیں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

بندرا بن کے اس سلوک سے بن مالی شرم سے سمٹ گیا تھا۔

چھوٹنے پر بھائی کے ساتھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔
 بندرا بن اُسی جگہ راستے میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور آسمان
 کی طرف مُنہ اٹھا کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ”لے ایشور! تم نے
 مجھ سے چرن کو چھین لیا، لیکن میری آنکھوں سے یہ نگاہ نہ چھین لینا
 آج جس نظر سے میں نے ان بچوں کو دیکھا ہے، اے پر بھو! مجھے یہ
 بردان دو کہ میں ہمیشہ اسی طرح سب بچوں کی شکل میں اپنے چرن کی
 شکل کو دیکھ سکوں، اسی طرح یہ دونوں ہاتھ اُنہیں ٹکے سے لگانے
 کے لئے ہمیشہ آگے بڑھا کریں۔ کیشب! تم شمشان میں کھڑے ہو کر
 جن لوگوں کو گالیاں دیتے تھے۔ وہ شاید تمام بد معاش نہیں ہیں۔“
 کیشب نے ہاتھ پکڑ کر کہا — ”چلو، گھر چلو۔“

بندرا بن ”چلو“ کہہ کر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا اور دو چار قدم
 آگے بڑھ کر بولا بھائی، آج میرے پاگل پن کے لئے معاف کرنا۔
 کیشب، دل پر بہت بھاری بوجھ پڑا ہوا تھا، میں حیران تھا کہ مجھے
 یہ سزا کیوں مل رہی ہے؟ میں نے اپنے ہوش میں کوئی گائے ہتیا،
 یا براہمن ہتیا نہیں کی تھی، جس کے لئے بھگوان مجھے اتنی کڑی سزا دیتے۔
 میرا.....“

بات ختم ہونے سے پیشتر ہی کیشب گرج کر بولا ”اُس حرام زادے
 بوڑھے گھوشال سے پوچھو۔ وہ تو کہے گا کہ یہ سب سزا اُس کے پوجا پا
 کا اثر ہے، اور دوسرے باجی بد معاش سے پوچھو تو وہ کہیگا کہ تجھے

جنم کے گناہ کا پھل ہے۔ اُن ایسی اس ملک کے براہمن ہیں یہی ہماری ہندو قوم اور ہندو دھرم کے واحد ٹھیکیدار اور محافظ ہیں۔“

بند راہن نے بڑی ملائمت سے کہا۔ ”بھائی کیشب !
 کالے سانپ کی دُم پر لاٹھی مارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سڑے ہوئے
 دہی کی بدبو کا الزام دودھ کے سر ڈالنا غلطی ہے۔ بلکہ دیکھنا تو یہ چاہیے
 کہ یہ جہالت براہمنوں کو بھی کہاں تک تباہی اور بربادی کے پتہ تک
 گڑھے کی جانب کھینچ لے گئی ہے۔“

میشب گذشتہ عبرت ناک اور رنجورہ واقعات کو یاد کر کے غصے
اور افسوس کے مارے اندر ہی اندر جل بھن رہا تھا۔ جو منہ میں آیا
کہنے لگا: ”پھر اتنی کڑی سزا کیوں؟“

بنی رابن نے جواب دیا۔ یہ سزا تو نہیں ہے، کیشب ہی بات تو میں تم سے کہہ رہا تھا کہ جب مجھے اپنے کسی گناہ کی یاد ہی نہیں آتی تو میں اسے گناہ کی سزا سمجھ کر اپنے آپ کو حقیر نہیں سمجھنا چاہتا۔ اس زندگی میں تو مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہو۔ پھر پچھلے جہنم کے سر پر بھی فضول الزام لگانا پاک اور پوتر روح کی بے عزتی کرنا ہے۔ اس لئے نہ تو یہ میرے گناہ کی سزا ہے اور نہ کسی قصور کا نتیجہ۔ یہ میرے گورد کی پدوی کے لوگی بننے کی قسمت ہے۔ کوئی بڑی چیز بغیر قربانی کے حاصل نہیں ہوتی۔ کیشب آج چرن کی موت سے جتنا روٹھا کا سبق مجھے ملتا ہے ایسا سبق بیٹے کے غم کی قربانی کے علاوہ اور کسی

بابو درگا داس نے کہا: لیکن تم نے اپنی تمام دولت تو پانی کی تکلیف دفع کرنے کے لئے دان کر دی ہے۔ اب تمہاری گزراوقات کیسے ہوگی؟“
 بندر بن نے شرمیلی ہنسی ہنس کر دیوار پر شکستی ہوئی جھولی دکھا کر جواب دیا: ”ماسٹر جی! ویشنو کے لڑکے کو مٹھی بھر بھیک کی کہیں کمی نہ ہوگی۔ میری باقی زندگی اسی کے سہارے مزے میں کٹ جائے گی۔ پھر یہ جائداد تو میرے چرن کی تھی، میں نے اسے اُسی کے سنگی ساتھیوں کی بہتری کے لئے ہی دان کر دیا۔“

بابو درگا داس براہمن اور بوڑھے ہونے کے باوجود مٹرا دھکے دن سب کام خود ہی کراتے رہے تھے۔ اس لئے کسٹم کو وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے، اُس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: ”نہیں بھیا! یہ بھیک نہیں۔ تمہاری بات اور ہے، لیکن بہو کے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہوگی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“

بندر بن نے سر جھکا کر کہا: ”وہ اپنے بھائی کے پاس ہے گی۔“
 بابو درگا داس بندر بن کو اپنے پنچوں کی طرح محنت کرتے تھے اُسکی مصیبت اور سب سے بڑھ کر اس کے گھر چھوڑنے کے فیصلے سے وہ بہت دکھی تھے۔ روکنے کی آخری کوشش کرنے ہوئے بولے: ”بندر بن! تمہیں اپنی خیم بھومی چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں رہ کر بھی تو پہلے کی طرح سب کام ہو سکتے ہیں؟“

بندر بن کی آنکھیں بھرا آئیں۔ اُس نے جواب دیا: ”اب بھیک

مانگ کر گزارہ کرنے کے علاوہ میرے لئے کوئی راستہ نہیں۔ لیکن وہ مجھ سے یہاں نہیں مانگی جائیگی۔ اس کے علاوہ اس گھر میں جہاں بھی میری نظر پڑتی ہے، وہیں مجھے چرن کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا بنا ہوا کوئی نہ کوئی نشان دکھائی دیتا ہے۔ ماسٹر جی! مجھے معاف کریں۔ میں بھی آخر انسان ہوں۔ میرا سر اس پہاڑ کے سے بوجھ سے پس جائیگا؟ بابو درگا داس غمگین ہو کر خاموش ہو گئے۔

جس ڈاکٹر نے چرن کا آخری وقت میں علاج کیا تھا۔ اُس دن کے دروانِ گیز واقعہ نے اُس کے دل کو بھی بے چین کر دیا تھا۔ اُس ہیبتناک اور عبرت انگیز واقعہ کا انجام دیکھنے کی خواہش نے اُس کے دل کو بے چین کر دیا اور بند ربان کے لئے اُس کے دل میں جو زبردست کشش پیدا ہو گئی تھی وہ اُسے شراہہ والے دن کلکتہ سے کھینچ کر وہاں لے آئی تھی۔ اب تک وہ تمام باتیں چپ چاپ سُنتا رہا تھا۔ جدرابن کے اتنے بڑے تباہ کی وجہ تو کسی طرح اُس کی سمجھ میں آ سکتی تھی، لیکن وہ کافی غور و فکر کے باوجود یہ سمجھنے میں ناکام رہا کہ کیشب اپنی مستقبل قریب کی ترقی کو نظر انداز کر کے اس ناپچیز پاٹھشالہ کی ذمہ داری اتنی خوشی سے اپنے سر کیوں لے رہا ہے؟ اُس نے حیران ہو کر اپنے دوست سے پوچھا۔ ”کیشب، کیا تم واقعی اپنے روشن اور شاندار مستقبل کو چھوڑ کر اس پاٹھشالہ میں اپنی تمام زندگی گزار دو گے؟“ کیشب نے جواب دیا۔ ”تعلیم دینا ہی تو میرا کام ہے۔“

ڈاکٹر نے کچھ جوش میں آکر کہا۔ ”یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن ایک کالج کی پروفیسری اور اس پاٹھشالہ کی پرنسپال کی کیا دونوں برابر ہیں؟ بھلا میں بھی تو سبوں کہ اس میں تم اپنی ترقی کی کیا امید رکھتے ہو؟ کیشپ نے اُسی طرح سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”بہت کچھ انہماک باہوا سہ پیہ پیہ کمانا اور ترقی دونوں ایک نہیں ہیں“

”یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ایک چیز نہیں ہیں۔ لیکن ایسے گاؤں میں رہائش رکھنا بھی ایک بہت بڑے گناہ سے کم نہیں، اُف اس کے تصور ہی سے بدن سکارتونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!“

بنتہا بن نہیں پڑا اور کیشپ کے جواب دینے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”کیا یہ صاف گاؤں کا ہی قصور ہے۔ ڈاکٹر صاحب! آپ لوگوں کا نہیں؟“ آج میری بر حالت کو دیکھ کر آپ کانپ اٹھے ہیں۔ لیکن ایسی ہی ابتر حالت میں ہر سال کتنے ہی چھوٹے چھوٹے معصوم بچے، کتنے ہی انسان اور کتنی ہی عورتیں اپنے معصوم اور بلکتے ہوئے بچوں کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں نکلتی ہیں۔ کیا اس پر کسی کی نگاہ گئی؟ اگر آپ پڑھے لکھے اور تہذیب امتدین کے ٹھیکیدار ہم لوگوں کو جنگلی، جاہل، گنوار اور غریب کہہ کر نفرت و رے رچی سے چھوڑ کر نہ چلے جاتے تو ہم لوگ علاج معالجہ کے بغیر اور ملک سے تڑپ تڑپ کر نہ مرتے۔ ڈاکٹر صاحب! برا نہ مانئے گا۔ جو لوگ آپ کے کھانے کے لئے اناج، پہننے کے لئے کپڑے، رہنے کے لئے مالیشان مکان اور زندگی کی دوسری ضروریات مہیا کرتے

، وہ بندھن غریب اور جاہل انہی دیہات میں رہتے ہیں۔ ان کو پاؤں لے روند کر آپ لوگوں کے اوپر چڑھنے کی سیڑھی تیار ہوتی ہے کیٹیب نے اسے پاس کرنے پر بھی ترقی کے اس راستے سے منہ پھیر لیا ہے اور سب اس نے اپنی خوشی سے کیا ہے۔

کیٹیب یکا یک جذبات سے مغلوب ہو کر بند رابن کو درمیان ہی روک کر بولا ”بند رابن! تم نے مجھے انسان بننے کا اتنا بڑا موقعہ ملے! دس سال بعد تم ایک بار پھر مہربانی کر کے یہاں آنا اور دیکھنا کہ تمہاری جہنم بھومی میں دولت اور تسلیم دونوں کی نہریں بہہ رہی ہیں یا نہیں؟“

بابو درگا داس اور ڈاکٹر انباش بابو دونوں ہی عقیدت اور حیرت سے ان دونوں دوستوں کا منہ دیکھنے لگے۔

کل بند رابن صرف بھکشاک جھولی لے کر باڈل سے چلا جائیگا اور موتا پھر تا کسی ایسی جگہ کی تلاش کرے گا جہاں رہ کر وہ اسے نوے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو سکے۔ کیٹیب نے اسے کچھ ان اپنے گاؤں میں موید ٹھہرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن بند رابن نے اس کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا، وہ دیکھ سکے اور رنج و راحت کا پورا پورا احساس بنا چاہتا تھا۔

روانگی کی تیاری مکمل کر کے اس نے ٹھا کر پوجا کا رخص پر وہیت کیٹیب کو سوئپ دیا اور نوکر نوکرانیوں وغیرہ سب کا مناسب

انتظام کر دیا۔ اُس کی والدہ نے اپنے صندوق میں جو روپے جمع کر رکھے تھے، وہ سب روپے اُس نے انہی لوگوں میں تقسیم کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

ابھی تک اُس نے کسٹم کی کوئی خبر نہیں لی تھی۔ اس نے اس طرف توجہ دینے کی کوئی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔ جس دن اُس نے چرن کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا تھا اسی دن سے بند رابن کے دل میں اُس کے لئے ایک طرح کی بے التفاتی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ بے التفاتی چرن کی وفات کے بعد خواہش نہ ہونے کے باوجود نفرت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسی لئے اُس نے یہ بات معلوم کرنا بھی ضروری نہیں سمجھی تھی کہ کسٹم کیوں آئی ہے؟ کس طرح آئی ہے؟ اور کس لئے ابھی تک یہاں ٹھہری ہوئی ہے؟ اُس کا خیال تھا کہ وہ خود ہی آئی ہے اور کریا کرم کے بعد خود ہی چلی جائیگی۔ اُس کی موجودگی میں اگرچہ اکثر اوقات کسی کام کے متعلق بند رابن مجبور ہو کر کئی بار اس سے بات چیت بھی کر لیتا تھا، لیکن اُس دن صبح کے علاوہ پھر کبھی اُس نے اُس کے چہرے کی جانب آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ دوسری طرف کسٹم نے بھی اُس سے بات چیت کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ لیکن اب جب روانگی کا وقت نزدیک آ گیا تو بند رابن کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا کہ کسٹم کب جائے گی۔ یہ بات دریافت کرنے کے اس نے ایک دہری کو کسٹم کے پاس اندر بھیجا اور خود باہر کھڑا ہو کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

داسی نے جواب دیا — اسے سب باتوں کا پتہ ہے۔
 بندربان نے اور بھی متعجب ہو کر کہا: ”اچھا تو پھر جا کر پوچھ آؤ
 کہ کیا وہ یہاں اکیلی ہی رہیں گی؟“
 داسی ایک ہی منٹ میں پوچھ کر لوٹ آئی اور جواب دیا —
 ”ہاں“

اب بندربان خود ہی اندر چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا ایک ایک
 دروازہ کھول کر اُسے اندر داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ تھوڑا سا
 دروازہ کھول کر اندر بھاٹکتے ہی اُس کا جسم کانپ اٹھا۔ جلے ہوئے
 گھر کی جلی ہوئی دیوار کی مابند کُسم دروازے کی جانب مُنہ کئے کھڑی
 تھی، اور بے چین اور تجسس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بندربان آج
 پہلی دفعہ یہ دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا کہ بیٹے کا غم انسان کو کتنی جلدی کیا ہے
 کیا بنا دیتا ہے۔

دروازہ کھلنے کی آواز سے کُسم چونک پڑی اور آگے بڑھ کر اسے اچھی
 طرح کھولتے ہوئے بولی: ”اندرا آ جاؤ“

بندربان کے اندر داخل ہوتے ہی کُسم نے دروازہ بند کر کے گنڈی
 لگا دی اور اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بندربان کو شک ہوا کہ
 شاید اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے، اور یہ پاگل ہو گئی ہے، یہ
 سوچ کر وہ کانپ اٹھا کہ دیوانگی میں وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے لیکن کُسم
 نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ وہ گلے میں آپٹل ڈال کر پتی کے چرنوں

میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ بندہ راہن کو خوف کے مارے ہلنے بھلنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ وہ چُپ چاپ وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔
 کسٹم بہت دیر تک اُسی طرح پڑی ہوئی گویا اُن چہروں میں سے
 از سر نو زندگی حاصل کرنے لگی۔ بڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور پتی کے
 منہ کی طرف دیکھ کر بڑے زور سے سسکیاں لیتی ہوئی بولی: ”سب
 کھتے ہیں کہ تم بہداشت کر سکتے ہو، لیکن میرے دل میں تو دن رات بھیاںک
 آگ بھڑک رہی ہے۔ میں اس سے کیسے بچوں گی؟ اور آپ کو چھوڑ کر
 میں مردہ کی بھی تو کیسے؟“

اُس وقت دونوں کے دلوں میں ایک ہی آگ سداگ رہی تھی۔
 بندہ راہن کے دل کی نفرت جل کر براکھ ہو گئی۔ اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر
 کہا: ”کسٹم! جس طرح مجھے تسکین ملی ہے، اُسی طرح تمہیں بھی ملے گی۔
 اس کے علاوہ تسکین کا اور کوئی ذریعہ نہیں!“

کسٹم چُپ چاپ دیکھتی رہی۔ بندہ راہن نے پھر کہا: ”کسٹم! میں
 جانتا ہوں کہ تم چرن سے کتنا پیار کرتی تھیں۔ اس لئے میں تمہیں بھی
 اُسی راہ پر بلا رہا ہوں۔ تمہارا چرن مرا نہیں، کھویا بھی نہیں، وہ صرف
 چھپا ہوا ہے۔ ایک دفعہ اچھی طرح دیکھنا سیکھ لو گی تو تمہیں معلوم ہوگا
 کہ یہاں جتنے لڑکے اور لڑکیاں ہیں ہمارا چرن اُن سب کے ساتھ ہے۔
 کسٹم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے پھر ایک بار پتی کے
 چہروں میں اپنا سر رکھ دیا۔ غصہ مٹ گیا اور بعد میں اٹھا کر کہا: ”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی“

